جامعہ نظامیہ شبلی گنج حیدرآباد - ۲

جامعہ نظامیہ حیدرآباد کا علمی و دینی سالنامہ

مجلہ

انوارِ نظامیہ

رجب ۱۳۸۸ھ ہجری اکتوبر ۱۹۶۸ء

مجلسِ ادارت

۱۔ مولانا مفتی محمد عبدالحمید صاحب شیخ الجامعہ ۔ ۲۔ مولانا سید طاہر رضوی صاحب دکن

۳۔ محمد سلطان محی الدین معتمد (مدیر) ۔ ۴۔ محمد خواجہ شریف دکن (نائب مدیر)

قیمت ۔ مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد (اے۔پی) ۔ ۲ دو روپے

فہرس

(حصۂ اُردو)

(عربی)

ابتدا سازم بنام پاک آں بے ابتدا
در رہ ادراک او ہر عقل را عجز انتہا

آغازِ سخن

آزاد ہندوستان کے سیکولر اسٹیٹ میں مُسلمان ایسے ہی شہری ہیں جیسے اکثریتی طبقہ کے افراد۔ جمہوریہ ہند کے دستور نے ہر طبقہ و فرقہ کو اپنے مذہب و دین، ثقافت و تہذیب اور اپنے مخصوص روایات و معتقدات کی حفاظت و اشاعت کی مکمل آزادی و اختیار عطا کیا ہے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ دوسرے طبقات کی طرح مسلمان بھی اپنے وسائل و ذرائع سے حسب صوابدید اپنے دین و مذہب اور ان روایات و اقدار کی حفاظت و اشاعت کریں جو انھیں عزیز ہیں۔ منجملہ اور ذرائع کے فی زماننا اس کا ایک اہم ذریعہ پریس اور دار الاشاعت ہے جس کے قیام و استحکام کا مسئلہ ہم سب کی اوّلین توجہ کا محتاج ہے۔ حیدرآباد میں یہ کام چھوٹے اور بڑے پیمانہ پر انجام پاتا رہا ہے اور سابق میں مجلس اشاعۃ العلوم جامعہ نظامیہ کے زیر اہتمام بھی اسی نوع کا تھوڑا بہت کام ہوتا رہا ہے لیکن دست برد زمانہ اور رہنمائے ملت کے عدم ذوق و دلچسپی کے باعث یہ بھی یک لخت رُک گیا۔ ایک عرصہ سے اس کمی اور ضرورت کو محسوس کیا جاتا رہا اور یہ ارادہ کیا گیا کہ کم از کم جامعہ نظامیہ سے ایک علمی، اخلاقی اور اصلاحی ماہوار رسالہ شائع کیا جائے جس میں اسلام کی تعلیمات، اس کے علوم و فنون، مذہب و اخلاق، تہذیب و ثقافت، تاریخ و فلسفہ پر علمی و تحقیقاتی بلند پایہ مضامین شائع ہوں تاکہ مسلمانوں کے دینی و علمی معلومات میں اضافہ ہو اور جو لوگ اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے کسی غلط فہمی کا شکار ہیں یا قصور معاملات کی وجہ سے حقیقت سے دُور اور نا آشنا ہیں ان کے خیال و فکر کی اصلاح ہو سکے۔ لیکن گوناگوں مالی مشکلات کی وجہ سے جن کا ہنوز سلسلہ جاری ہے اب تک یہ مفید و مقصدی کام حیز التواء میں رہا۔ بریں ہم اس سال "بسمہ سبحانہ تعالیٰ" یہ ارادہ کر لیا گیا کہ کسی نہ کسی طرح سالنامہ ہی شائع کر دیا جائے۔

الحمد للہ کہ یہ "سالنامہ" بانی جامعہ مولانا انوار اللہ خانؒ اور خود جامعہ نظامیہ کی دُہری نسبت سے انوارِ نظامیہ کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے اور جوں ہی وسائل و ذرائع مہیا ہو جائیں ماہوار رسالہ یا کم از کم سہ ماہی رسالہ کی اشاعت عمل میں لائی جائے گی۔

سامان اشاعت ایسے وقت فراہم ہوا کہ سالنامہ ہماری آرزوؤں کا پورا ترجمان تو نہیں بن سکا۔ بہر حال نقش اول ہدیۂ ناظرین ہے۔ انشاء اللہ العزیز نقش ثانی بہتر اور برتر ہوگا۔ ہم نے تیمناً سالنامہ کا پہلا مضمون مؤسس جامعہ نظامیہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حافظ انوار اللہ خاں فضیلت جنگ علیہ الرحمہ کا بصیرت افروز مقالہ "علم دین کی فضیلت وضرورت" رکھا ہے جو مولانا رح کی تصنیف مقاصد الاسلام حصہ چہارم کا دوسرا مقالہ ہے۔ یہ بلند پایہ مضمون کئی وجوہ سے منفرد اور بہ حالات موجودہ بیحد مفید اور موثر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بانی جامعہ علیہ الرحمہ نے مستقبل میں دینی تعلیم سے جو بے اعتنائی برتی جانے والی تھی اس سے مسلمانوں کو پیش از پیش آگاہ کردیا تھا اور اس حقیقت کو بھی واضح کردیا تھا کہ اسلام کی زندگی دراصل علم دین سے وابستہ ہے۔ اگر اس کے حاصل کرنے میں کسی قسم کی غفلت وکوتاہی اور بے توجہی برتی گئی تو مسلمانوں کا یہ عمل خود ان کے ضعف اور محکومی کا باعث ہوگا۔

سالنامہ اردو وعربی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اردو میں علاوہ مضامین کے فتاوی کا اضافہ ہے اور اخیر میں ادبیات کے زیر عنوان کچھ منتخب نظمیں بھی دی گئیں ہیں۔ اس طرح حصہ عربی میں بھی عربی مضامین کے علاوہ نظمیں بھی رکھی گئیں ہیں۔ ہر دو حصوں میں مناسب ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے اور اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ سالنامہ اعلیٰ معیار کا حامل اور سب کے لیے یکساں مفید ہو۔

بہ سلسلۂ اشاعت ہم اساتذۂ جامعہ، فارغین علماء ودیگر فاضل مضمون نگار اور شعرا صاحبان کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہماری درخواست پر اپنے تحقیقی مقالے، علمی مضامین اور قلمی نگارشات ونظمیں بھیجیں جن سے سالنامہ کی ترتیب وتدوین عمل میں آسکی۔ ہم جناب محترم صدر نشین مجلس انتظامی جامعہ نظامیہ کے تہ دل سے ممنون ہیں کہ ان کے گراں قدر مشوروں کے نتیجہ میں یہ سالنامہ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہے۔ نیز صدر مجلس ادارت مولانا محمد عبد الحمید صاحب شیخ الجامعہ نظامیہ کے بھی شکر گزار ہیں کہ جن کے مفید مشوروں سے سالنامہ کی اشاعت ممکن ہوسکی۔ ناسپاسی ہوگی اگر ہم اس حقیقت کا اظہار نہ کریں کہ مولانا حکیم اسعد الدین صاحب صدر مجلس اشاعۃ العلوم نے ازراہ علم دوستی اپنی مجلس مذکور سے رقمی اعانت کا پیش کش فرمایا جس سے سالنامہ کی اشاعت کا کام ہمارے لیے آسان ہوگیا۔ فشکر اللہ مساعیہم۔

علمِ دین کی فضیلت و ضرورت

از افادات معارف آگاہ حقائق دستگاہ العارف باللہ شیخ الاسلام مولانا شاہ انوار اللہ فضیلت جنگ علیہ الرحمہ
بانیٔ جامعہ نظامیہ

الحمدُ للهِ ربِّ العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمدٍ وآلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔

یہ بات پوشیدہ نہیں کہ ہر دین چند اعتقاد اور اعمال کا نام ہے جن کی وجہ سے وہ دوسرے ادیان سے ممتاز ہوتا ہے اور وہ دینی عقائد کسی میں نہ پائے جائیں تو وہ اُس دین کا آدمی نہ سمجھا جائے گا مثلاً یہودی خدا اور تمام انبیاء کے قائل ہیں جس کو عیسائی مانتے ہیں مگر صرف عیسیٰ علیہ السلام کو اور اُن کے چند خاص عقائد کو نہ ماننے کی وجہ سے وہ عیسائی نہیں ہوسکتے اسی طرح اور ادیان کا حال ہے اور ہر دین والے کا طبعی مقتضا ہے کہ اپنے دین کو باقی رکھنے اور شائع کرنے میں کوشش کرتا ہے۔ دُنیا میں کوئی دین اور مذہب والی قوم ایسی نہیں کہ اپنے دین اور مذہب کی حفاظت میں جان و مال سے کوشش نہیں کرتی۔ جو قومیں دنیوی حیثیت سے مہذب سمجھی جاتی ہیں انھوں نے اس باب میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے چنانچہ پوپ جو دینی صیغہ کا افسر ہوتا ہے بجائے خود ایک مستقل رئیس ہے جس کو قومی رعایتوں کی وجہ سے مالی ضرورتوں میں سلطنت کی طرف کوئی احتیاج نہیں۔ (پادری جو دین عیسوی کے علماء ہیں اپنے اقتدار سے کروڑہا روپیہ مذہبی مدارس اور دینی علوم کی اشاعت میں صرف کردیتے ہیں لیکن اس مہذب اور ترقی پسند قوم میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ ان پُرانے خیالات کا شائع کرنا مانع ترقی قوم ہے اور ان کی قوم میں وہ عزت ہے جو دوسرے کو نصیب نہیں) اسی طرح ہندوؤں کی مذہبی تعلیم ہندوستان میں شائع اور ذائع ہے اس مشاہدہ سے ثابت ہے کہ ہر قوم اور ہر سلطنت خواہ مہذب ہو یا غیر مہذب اپنے دین اور مذہب کی قدرداں ہے اور اس کی حفاظت اور اشاعت میں دریغ نہیں کرتی برخلاف ان کے ہمارے حضرات اہل سنت والجماعت سلمہم اللہ تعالیٰ اس کو چنداں ضروری نہیں سمجھتے چنانچہ اس پر قرینہ یہ ہے کہ تھوڑے ہی سال پہلے ہندوستان میں بہت سے دینی مدارس قائم تھے اور اب صرف معدودے چند رہ گئے ہیں جن کا شمار انگلیوں پر ہوسکتا ہے اور ان کی بھی یہ حالت ہے کہ اگر دنیوی مدارس کے ساتھ اُن کا موازنہ کیا جائے تو ہر لحاظ سے کالعدم سمجھے جائیں گے اس سے ظاہر ہے کہ جو مذہب اس کس مپرسی حالت میں ہو اس کا انجام کیا ہوگا۔

اسی کو دیکھ لیجئے کہ عموماً اہلِ اسلام باشندگان ہندو دکن اہلِ سنت و جماعت تھے اور اسی چالیس پچاس

سال کے عرصے میں کتنے مذاہب باطلہ بن گئے۔ ان میں جتنے فرقے مختلف ناموں سے پکارے جاتے ہیں سب اہل سُنت و جماعت سے نکلے ہوئے لوگ ہیں کیونکہ ان میں نہ ہندو شریک ہوئے نہ یہود و نصاریٰ نہ شیعہ اس سے ظاہر ہے کہ جس قدر ان مذاہب باطلہ کی مردم شماری ہے وہی تعداد ان اشخاص کی ہے جو ہمارے مذہب سے خارج ہو گئے ہیں اور روز بروز ان کی تعداد بڑھتی اور سُنیوں کی تعداد گھٹتی جاتی ہے۔ اگر ہماری کثیر التعداد قوم متوجہ ہوتی تو کیا ممکن تھا کہ یہ چھوٹے چھوٹے فرقے ہمارے عزیز و اقارب کو ہم سے چھین سکتے؟

یہ بات پوشیدہ نہیں کہ مذہب کی حفاظت اور اشاعت اس زمانے میں صرف علماء سے متعلق ہے، کیونکہ ہر مذہب و ملت والا شخص اپنے مذہب کی ترقی چاہتا ہے چنانچہ فرق باطلہ کے عالم جاہلوں پر ان کے مذہب کی خرابی اپنے مذہب کی عمدگی تحریر و تقریر سے ثابت کرتے رہتے ہیں اگر ان کا جواب مذہب کی طرف سے نہ دیا جائے تو جہلا تو کیا متوسط اور کم درجے کے علماء بھی متزلزل ہوتے جاتے ہیں۔ اگر اعلیٰ درجے کے علماء مذہب میں نہ ہوں جو ہر قسم کے اعتراضوں کے جواب دے سکیں تو ظاہر ہے کہ مخالفین جو ہر فن میں کمال حاصل کرتے ہیں اقسام کے اعتراض کر کے مذہب کو اہلِ مذہب کے خیالوں میں کم وقعت بلکہ بے اصل ثابت کر دیں گے جس سے مذہب کا باقی رہنا ممکن نہ ہو گا اسی وجہ سے حدیث شریف میں ہے:-

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم موت العالم ثلمۃ فی الاسلام۔ (کذا فی کنز العمال)	یعنی فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ عالم کی موت اسلام میں ایک رخنہ ہے۔

ظاہر ہے کہ جب تک اس عالم کا کوئی جانشین نہ ہو اس رخنے کا انسداد نہیں ہو سکتا۔ اب زمانہ سابق اور حال کو صرف سرسری نظر سے دیکھئے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس زمانے میں ایک ایک عالم کے جانشین ان کے صدہا شاگرد ہوتے تھے اور اب جو مشہور اور دین کی حفاظت کرنے والے علماء کا انتقال ہوتا ہے تو اُن کا قائم مقام ایک بھی نہیں ہوتا حالانکہ ہر زمانے میں مسلمانوں کو علماء کی اشد ضرورت ہے جیسا کہ حدیث شریف سے ثابت ہے۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان مثل العلماء کمثل النجوم فی السماء یھتدی بھا فی ظلمات البر والبحر فاذا انطمست النجوم اوشك ان یضل الھداۃ (کذا فی کنز العمال)	یعنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ علماء کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان میں ستارے جن سے جنگل اور سمندر میں لوگ راستہ پاتے ہیں اگر ستارے نہ رہیں تو جو لوگ راستہ پر ہیں وہ بھی راہ گم کر دیں گے۔

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ علماء ہی کے انفاس کی برکت ہے کہ ہر وقت جو شبہات اور وساوس شیاطین الجن والانس مسلمانوں کے دل میں ڈالتے رہتے ہیں وہ دفع ہو جاتے ہیں۔ اگر ان حضرات کی صحبت میسر نہ ہو تو اس تاریکی کے زمانے میں بہت سے گمراہ ہو جائیں۔ تائید دین میں ان حضرات کی سعی مجاہدوں کی کوشش سے کم نہیں چنانچہ حدیث شریف ہے:-

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوزن یوم القیامۃ مداد العلماء ودم الشہداء فیرجح علیہم مداد العلماء علیٰ دم الشہدا۔ (کذا فی کنز العمال)

یعنے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ علما نے جس سیاہی سے لکھا ہے وہ اور شہیدوں کے خون قیامت کے روز وزن کئے جائیں گے اس وقت ان کی سیاہی کا ہی وزن غالب ہوگا۔

کیوں نہ ہو؟ مجاہدوں نے جو ملک اپنی جانبازی سے فتح کیا تھا علما کی جانفشانیوں سے اس میں اسلام باقی رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ طالب علم مجاہد فی سبیل اللہ سے بھی افضل ہوتا ہے۔

کما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم طالب العلم افضل من المجاھد فی سبیل اللہ۔ (کذا فی کنز العمال)

یعنے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ طالب علم مجاہد فی سبیل اللہ سے بھی افضل ہے۔

اور دوسری حدیث شریف میں ہے:-

العلم افضل عند اللہ من الصلوٰۃ والصیام والحج والجہاد فی سبیل اللہ تعالیٰ۔ (کذا فی کنز العمال)

یعنے فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ علم اللہ تعالیٰ کے نزدیک نماز روزہ، حج اور جہاد سے بھی افضل ہے۔

اور یہ بھی حدیث شریف ہے:-

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم العلم افضل من العبادۃ۔ (کذا فی کنز العمال)

یعنے فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ علم عبادت سے افضل ہے۔

اس کی وجہ دوسری حدیث سے معلوم ہوتی ہے:-

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم العلم حیاۃ الاسلام وعماد الدین۔ (کذا فی کنز العمال)

یعنے علم اسلام کی حیات اور دین کا ستون ہے۔

ظاہر ہے کہ جس چیز سے اسلام کی حیات اور بقا متعلق ہو اس سے عبادت کیوں کر افضل ہوسکے کیونکہ کل عبادتوں کا دارومدار اسلام ہی پر ہے اور اسلام کا مدار علم پر۔ غرض کہ علم کی فضیلت جس قدر بیان کی جائے تھوڑی ہے اور جو حدیثیں لکھی گئیں مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔

ان تمام حدیثوں سے مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظاہر ہے کہ ہر زمانے میں اہل اسلام علم کی تحصیل اور اس کے باقی رکھنے کا اہتمام سب عبادتوں سے زیادہ کریں جس سے خدا اور رسول کی خوشنودی حاصل ہو اب غور کیجئے کہ جب یہ ضرورت اور فضیلت علم ہر زمانے میں رہی ہے تو اس زمانے میں کس قدر اس کی ضرورت اور فضیلت جملہ عبادات پر ثابت ہوگی کیونکہ اس پر آشوب زمانے میں علوم جدیدہ کی آندھی دینی خیالات کو درہم برہم کرنے والی ہر طرف سے اٹھ رہی ہے دشمن اسلام اور ملاحدہ وغیرہ اعتراضوں

کی بوچھار ہمارے دین پر ہر طرف سے کر رہے ہیں جن کے جواب سوائے چند علما کے ہر عالم تو نہیں دے سکتا اور معترضوں کی جماعتیں اپنے قومی سرمایہ سے ترقی کرتی جاتی ہیں اور ہمارے مقدس دین اور مذہب کے افراد کو ہم سے چھین کر اپنے قبضہ میں لے رہی ہیں برخلاف اُن کے نامی گرامی علماء جو انتقال کرتے جاتے ہیں ان کی جگہ نہ کوئی اُن کا قایم مقام ہوتا ہے اور نہ اُس کی فکر قوم کی طرف سے کی جاتی ہے اگر یہی حالت اور چند روز رہے تو آئندہ آنے والی نسلوں کو ہمارا دین و مذہب پہنچنے کی کیا صورت ہوگی عموماً قوم کی کم توجہی سے دینی مدارس کی جو حالت ہے اظہر من الشمس ہے یہ بات واضح رہے کہ ہر مسلمان پر اسلام کا حق ثابت ہے جس کا کوئی انکار کر نہیں سکتا۔ اور حیاتِ اسلام یعنے علم پر جو حالت گزر رہی ہے اس وقت ہمارے پیش نظر ہے اور باوجود اس کے کہ ہماری قوم میں بفضلہ تعالیٰ اتنا سرمایہ موجود ہے کہ آئندہ آنے والی نسلوں تک علم کو محفوظ رکھ کر پہنچا سکتے ہیں اگر ہماری کم توجہی سے خدانخواستہ حیاتِ اسلام یعنے علم مفقود ہو جائے تو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو سخت شرمندگی اُٹھانی پڑے گی۔

بفضلہ تعالیٰ اس وقت تک ہماری قوم میں ایسے افراد بہ کثرت موجود ہیں کہ اسلام کی برکت سے ہر کار خیر میں روپیہ صرف کرتے ہیں۔ چنانچہ نئی مسجدیں، پل، مسافر خانے، گنبدیں وغیرہ اکثر بنائی جاتی ہیں اور گوچہ گرد فقیروں کو روپیہ بھی بہت دیا جاتا ہے مگر اس خیال والے حضرات بہت کم ہیں کہ علم پر جس کو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے "حیاتِ اسلام" فرمایا ہے کیا گزر رہی ہے اور کس کس مپرسی حالت میں پڑا ہوا ہے۔ مدارسِ دینیہ میں جو طلبہ دور دراز سے سفر کر کے تحصیلِ علوم کے لئے آتے ہیں مگر چونکہ آمدنی موجودہ اس قدر نہیں ہے کہ سو ڈیڑھ سو طلباء کے جمیع حوائج پورے ہو سکیں اس لئے ان کو صاف جواب دیا جاتا ہے جس سے وہ محروم واپس ہوتے ہیں حالانکہ یہ لوگ وہ ہیں جن کی کمال درجہ کی وقعت خدائے تعالیٰ کے نزدیک مسلم ہے جیسا کہ اس حدیثِ شریف سے ثابت ہے:۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان الملائکۃ یبسط اجنحتہا لطالب العلم (کذا فی کنز العمال)

یعنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ طالبِ علموں کے قدموں کے نیچے فرشتے پر بچھاتے ہیں۔

ایک اور حدیثِ شریف یہ ہے:۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم مرحبا لطالب العلم ان طالب العلم لتحفہ الملائکۃ و تظلہ باجنحتہا ثم یرکب بعضہا بعضا حتی تبلغ سماء الدنیا من محبتہم لما یطلب۔ (کذا فی کنز العمال)

یعنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آفریں ہے طالب علم کو کہ فرشتے اس کو گھیرے ہوئے ہیں اور اپنے پروں سے اس کو سایہ کرتے ہیں اور اس کو لے کر آسمان تک پہنچاتے ہیں۔ یہ اس چیز کی محبت کے سبب سے ہے جس کو وہ طلب کرتا ہے یعنی اس کی یہ قدر علم کی وجہ سے ہوتی ہے۔

اب دیکھیئے کہ جس کی یہ قدر عالمِ علوی میں ہو اس کی تعلیم و پرورش پر روپیہ صرف ہو تو کیا عام کوچہ گرد فقراء کو

یعنے پختہ مسجدیں اور گنبدیں بنانے کے برابر بھی اس کا ثواب نہ ہوگا ؟ اور کیا خدا اور رسولؐ کی خوشنودی جو اور امورِ خیر سے مقصود ہے اس میں حاصل نہ ہوگی بزرگانِ دین کا ارشاد ہے کہ انسان وہ ہے جو خیر الخیرین میں تمیز کرے یعنے جب دو قسم کے نیک کام پیش ہوں تو ان میں سے اس کام کو پہچان کر اختیار کرے جو دونوں میں بہتر ہو۔ دیکھئے حدیث شریف سے ثابت ہے کہ پانی کا صدقہ سب سے افضل ہے مگر جن شہروں میں پانی کے نل جاری ہیں بخیال ثواب اگر کنویں کھدوائیں جائیں تو کیا شرعاً قابلِ تحسین ہوں گے خصوصاً ایسی حالت میں کہ دوسرا کارِ خیر جو دین میں اہم ہے درپیش ہو اسی طرح اگر دارالمساکین بنائے جائیں جس میں اندھے لنگڑے وغیرہ معذور رکھے جائیں تو وہ کیا طالبِ علموں کی دارالاقامت سے بہتر ہوں گے ؟ ہرگز نہیں! اس لئے کہ معذوروں کو روزانہ اس قدر آمدنی ہے کہ صرف کھانے کپڑے پر دارالمساکین میں رہنے کو ہرگز پسند نہیں کرتے برخلاف ان کے طلبائے دین کو کسی قسم کا کھانا کپڑا مل جائے تو وہ اس کو وظیفہ سمجھ کر کمال درجہ کے ممنون ہوتے ہیں پھر علاوہ اس کے ان کی پرورش سے اسلام کی حیات منصور ہے اور آئندہ آنے والی نسلوں تک دین و مذہب پہنچانے کا ذریعہ ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی جو غرض اشاعت اسلام ہے وہ انھیں سے پوری ہوتی ہے۔ اب غور کیا جائے کہ اس زمانے میں خیر الخیرین اور افضل دارالمساکین ہوگا یا محتاج طلبہ کا دارالاقامت۔ حدیث شریف ہے:۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما تصدق الناس بصدقۃ افضل من علم ینشر۔

(کذا فی کنز العمال)

فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ کسی نے ایسا صدقہ نہیں دیا جو علم کے پھیلانے سے افضل ہو۔

دیکھ لیجے اشاعتِ علم میں جو روپیہ صرف کیا جائے گا اس کا ہر قسم کے صدقات سے افضل ہونا اس حدیث شریف سے ثابت ہے۔ تحصیل علوم کے خیال سے جو طلبہ مصائبِ شاقہ اٹھا کر سفر دور دراز اختیار کرتے ہیں ان حضرات نے تو اپنا حقِ اسلامی ادا کیا جو حق تعالیٰ فرماتا ہے:۔

فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک جماعت مسلمانوں کی علم سیکھنے کی غرض سے نکلے اور بعد تحصیل علم کے اپنے قوموں میں واپس جا کر ان کو احکام اسلام معلوم کرائیں جس سے ان کو خوفِ خدا پیدا ہو۔

جس طرح ان طلبا نے حقِ اسلام اپنے ذمے کا ادا کیا اگر ہمارے ملک کے اہلِ خیر بھی اپنے ذمے کا حقِ اسلام ادا کریں یعنے صرفِ زکوٰۃ ان کے اخراجات میں دیا کریں تو ان کو مدارس سے محروم واپس ہونے کی نوبت نہ آئے گی اور اس ضمن میں دو اسلامی حق ادا ہو جائیں گے ایک زکوٰۃ دوسرا تائید اور ابقاء اسلام ایسے زمانے میں جبکہ اسلام نہایت غریب اور کس مپرسی حالت میں ہو رہا ہے۔

زکوٰۃ اسلام کا ایک ایسا ضروری اور مستحکم حق ہے کہ جس کو اسلام کا دعویٰ ہو وہ اس سے ہرگز بری نہیں ہو سکتا چنانچہ قرآن شریف میں ہے:۔

والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم یوم یحمیٰ علیھا فی نار جھنم فتکوی بھا جباھھم وجنوبھم وظھورھم ھٰذا ما کنزتم لانفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون۔

یعنے جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو عذاب دردناک کی خوش خبری سنا دو جس وقت کہ اس سونے چاندی کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا پھر اس سے ان کے ماتھے، کروٹیں اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی اور ان سے کہا جائے گا یہ ہے جو تم نے اپنے لئے دنیا میں جمع کیا تھا تو اپنے کئے کا مزہ چکھو۔

اور احادیث جو اس باب میں وارد ہیں بکثرت ہیں چند حدیثیں یہاں لکھی جاتی ہیں:۔

اخرج البخاری ومسلم وابوداؤد وابن منذر وابن ابی حاتم وابن مردویہ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: ما من صاحب ذھب ولا فضۃ لا یؤدی حقھا الا جعلت لہ یوم القیامۃ صفائح ثم احمی علیھا فی نار جھنم ثم یکوی بھا جنبہ وجبھتہ وظھرہ فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ حتی یقضی بین الناس فیری سبیلہ اما الی الجنۃ واما الی النار۔

(کذا فی الدر المنثور)

یعنے بخاری اور مسلم وغیرہ میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس کے پاس سونا و چاندی ہو اور وہ اس کا حق ادا نہ کرے یعنی زکوٰۃ نہ دے تو قیامت کے روز اس کی تختیاں بنا کر دوزخ کی آگ میں تپائی جائیں گی پھر اس سے داغ دئیے جائیں گے ان کے پہلو اور پیشانی اور پیٹھ پر۔ یہ معاملہ اس کے ساتھ پچاس ہزار برس تک ہوتا رہے گا جو قیامت کے دن کی مدت کا اندازہ ہے۔ یہاں تک کہ تمام لوگوں کے مقدمات حساب وکتاب وغیرہ کا فیصلہ ہو اس کے بعد اگر دوزخی ہو تو دوزخ میں ڈال لا جائے گا اگر جنتی ہو تو جنت میں داخل ہوگا۔

واخرج ابو یعلی وابن مردویہ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یوضع الدینار علی الدینار والدرھم علی الدرھم ولکن یوسع اللہ جلدہ فتکوی بھا جباھھم وجنوبھم وظھورھم ھٰذا

یعنے فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ یہ خیال مت کرو کہ اس مال سے داغ دیتے وقت دینار پر دینار اور درہم پر درہم رکھا جائے گا بلکہ اس شخص کا جسم اتنا چوڑا کیا جائے گا کہ ہر ایک درہم دوسرے درہم سے اور ہر دینار دوسرے دینار سے علیحدہ رہے۔

ما کنزتم لانفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون۔

مقصود یہ ہے کہ جس قدر بے زکوٰۃ مال زیادہ ہو عذاب کا احساس زیادہ ہوا اور حافظ ابن حجرؒ نے زواجر میں یہ حدیث نقل کی ہے :-

عن ابن ماجۃ واللفظ لہ، والنسائی باسناد صحیح، وابن خزیمۃ فی صحیحہ عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ. عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: ما من احد لا یودی زکوٰۃ مالہ الا مُثل لہ یوم القیامۃ شجاعا اقرع حتی یطوق بہ عنقہ ثم قرء علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" ولا یحسبن الذین یبخلون بما آتٰھم اللہ من فضلہ ھو خیرا لھم بل ھو شرلھم سیطوقون ما بخلوا بہ یوم القیامۃ .الایہ وفی روایۃ مسلم من اقام الصلوٰۃ ولم یؤت الزکوٰۃ فلیس بمسلم ینفعہ عملہ۔

یعنے فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شخص زکوٰۃ نہ دے قیامت کے روز اس کا مال ایک زہریلے سانپ کی شکل میں بنا کر اس کی گردن میں طوق ڈالا جائے گا پھر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی کہ جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے مال دیا ہے اور وہ بخیلی کرتے ہیں یعنے زکوٰۃ نہیں دیتے وہ یہ خیال نہ کریں کہ ان کے حق میں وہ بھلا ہے بلکہ بہت برا ہے قریب ہے کہ قیامت کے دن اس کا طوق ان کی گردنوں میں ڈالا جائے گا۔ غرض کہ مختلف طور پر اس مال سے عذاب دیا جائے گا اور فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شخص نماز پڑھے اور زکوٰۃ نہ دے وہ مسلمان نہیں اس کو کوئی عمل نفع نہ دے گا۔

وروی احمد وابوداود والترمذی والدارقطنی: ان امرأتین اتتا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفی ایدیھما سواران من ذھب فقال لھما: اتودیان زکوٰتہ؟ فقالتا لا؛ فقال لھما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اتحبان ان یسورکما اللہ سوارین من نار قالتا لا، قال فادیا زکوٰتہ۔ (کذا فی الزواجر)

ایک بار دو عورتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضر ہوئیں جن کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن تھے حضرت نے ان سے پوچھا کہ کیا تم ان کی زکوٰۃ دیتے ہو؟ کہا نہیں۔ فرمایا کیا تمھیں یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دو آگ کے کنگن تمھیں پہنائے؟ کہا نہیں۔ فرمایا تو پھر اس کی زکوٰۃ دیا کرو۔

اور زواجر میں یہ روایت بھی ہے :-

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم حصنوا اموالکم بالزکوٰۃ وداووا امرضاکم بالصدقۃ۔ (رواہ الطبرانی وابونعیم والخطیب)

یعنے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مالوں کے لئے زکوٰۃ سے قلعہ بناؤ یعنے زکوٰۃ دینے سے مال محفوظ رہتا ہے اور بیماروں کی دوا صدقہ سے کیا کرو۔

اور زواجر میں یہ روایت ہے کہ محمد بن یوسفؒ کہتے ہیں کہ چند تابعینؒ کے ساتھ وہ ابوسنان کی ملاقات کو گئے انھوں نے کہا کہ ہمارے ہمسایہ میں ایک شخص کا انتقال ہوگیا ہے چلو اس کی تعزیت کر آئیں جب ہم سب گئے تو دیکھا کہ ایک شخص زار زار رو رہا ہے اور بیقرار ہے بہت کچھ تسکین و تسلی کی باتیں کیں مگر اس کی حالت میں کچھ تغیر نہ ہوا آخر جب بہت اصرار کیا گیا تو اس نے بیان کیا کہ مجھے کیونکر تسکین ہو میرے بھائی پر صبح و شام عذاب ہو رہا ہے، ہم نے کہا کہ کیا تم کو غیب کی بات معلوم ہوتی ہے کہا نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب میں نے اس کو دفن کیا اور لوگ چلے گئے تو میں تھوڑی دیر ٹھیرا رہا اس عرصے میں اندر سے آواز آئی کہ ہائے لوگ مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے اور میں عذاب کی سختیاں اٹھا رہا ہوں حالانکہ میں نماز پڑھتا تھا اور روزے رکھتا تھا یہ سن کر میں بہت رویا اور بے اختیار میرا جی چاہا کہ قبر کھول کر دیکھوں جب مٹی نکالا تو دیکھا کہ اپنے بھائی کے اطراف آگ دہک رہی ہے اور اس کی گردن میں آگ کا طوق پڑا ہوا ہے اس کا طوق نکالنے کی غرض سے میں نے بے اختیاری سے ہاتھ بڑھایا چونکہ وہ فی الحقیقت آگ تھی میرا ہاتھ جل گیا چنانچہ اس نے ہاتھ دکھلایا کہ جل کر سیاہ ہوگیا تھا اس کے بعد میں نے اس پر ڈال کر واپس آگیا اب بتائیے کہ مجھے کیونکر تسکین ہو۔ ہم نے پوچھا کہ زندگی میں تمہارے بھائی کے کس قسم کے عمل تھے؟ کہا کہ وہ زکواۃ نہیں دیتا تھا ہم نے کہا کہ حق تعالیٰ نے اس آیت شریفہ کی تصدیق کرادی جو ارشاد ہے :۔

ولا یحسبن الذین یبخلون بما اٰتٰھم اللہ من فضلہ ھو خیرا لھم بل ھو شر لھم سیطوقون ما بخلوا بہ یوم القیامۃ۔ اور تمہارے بھائی پر قیامت سے پہلے عذاب شروع ہوگیا پھر ہم حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے اور یہ قصہ بیان کر کے پوچھا کہ یہود و نصاریٰ مرتے ہیں مگر اس قسم کا واقعہ سنا نہیں گیا انھوں نے فرمایا کہ ان کے دوزخی ہونے میں کوئی شبہ نہیں خدائے تعالیٰ نے تمھیں مسلمانوں سے ایک شخص کی حالت دکھلادی تاکہ عبرت حاصل کرو۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے "فمن ابصر فلنفسہ ومن عمی فعلیھا وما انا علیکم بحفیظ"۔ بخاری اور مسلم وغیرہ میں اس مضمون کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے ساتھ ہی بعض قبائل عرب نے کہا کہ ہم نماز، روزہ وغیرہ اوامر شرعیہ تو بجا لائیں گے مگر صرف زکواۃ نہیں دیں گے اس پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان سے جہاد کرنے کا ارادہ کیا عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا اس کی جان و مال محفوظ ہوگئی۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دلائل قائم کئے جن کو عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ نے تسلیم کیا چنانچہ زکواۃ نہ دینے والے مسلمانوں سے جہاد کیا گیا۔ غرض کہ اسلام میں زکواۃ ایک ضروری اور لازمی حق ہے۔

اگر انصاف سے دیکھا جائے تو جو نعمتیں حق تعالیٰ نے خاص مسلمانوں کے لئے اس عالم میں مہیا کر رکھی ہیں جن کا ذکر جا بجا قرآن شریف میں ہے ایسی بیش بہا ہیں کہ اگر تمام مال بھی ان کے حاصل

کرنے کے لئے خرچ کیا جائے تو کم ہے پھر وہ نعمتیں چند روز کے لئے نہیں بلکہ ابدالآباد اور ہمیشہ رہنے والی رہیں گی ایسی بیش بہا اور ہمیشہ رہنے والی نعمتوں کا استحقاق حاصل کرنے کے لئے اگر چند سال تھوڑا تھوڑا مال بارگاہِ کبریائی میں گزرانا جائے تو کونسی بڑی بات ہوگی پھر خدائے تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اس میں آسانی اور تخفیف کس قدر کی ہے کہ اگر سو روپیہ مثلاً کسی کے پاس رہیں تو صرف تین آنے چار پائی ماہانہ کے حساب سے اپنے ہی "مصالح قومی" میں صرف کریں جن کا ذکر بہ تصریح قرآن شریف میں موجود ہے اور اس حق کا مطالبہ کس نرمی اور تلطف سے فرماتا ہے کہ کیسا ہی بخیل ہو بشرطِ ایمان دل و جان سے اس کے ادا کرنے پر راضی ہو جائے چنانچہ ارشاد ہے قولہ تعالیٰ:-

ان تقرضوا اللہ قرضا حسنا یضاعفہ لکم و یغفر لکم و اللہ شکور حلیم ۔　　یعنے اللہ کو قرض دو گے تو وہ دونا کرکے تم کو دے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ شکر گزار یعنے قدرداں اور بردبار ہے ۔

مصارف زکوٰۃ جو حق تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں ان میں پہلے فقرا اور مساکین یعنے مفلسوں اور محتاجوں کا ذکر ہے۔ دیکھئے جب عام فقرا و مساکین کو ان کی پرورش کی غرض سے زکوٰۃ دینا بحسب آیت شریفہ ضروری ہوا تو جو فقرا اور مساکین ایسے ہوں جن سے علم دین کی اشاعت اور دین کی تائید اور آئندہ آنے والی نسلوں کو علم اور دین پہنچانا متعلق ہو ان کی پرورش کس قدر ضروری ہوگی۔ دین کی حالت موجودہ یہ بات ثابت کرتی ہے کہ اس وقت دینی کاموں میں اس سے بہتر اور ضروری کوئی کام نہیں کہ طلبہ کی حوصلہ افزائی ہو جس سے جوق جوق طلبہ علوم دینیہ حاصل کرنے کے لئے آئیں اور اپنے حوائج ضروریہ کی فکر سے فارغ البال ہوکر تحصیل و اشاعتِ علوم میں ساعی رہیں اور بحسب ضرورت متعدد مدرسے کھولے جائیں۔ اور یہ کوئی مشکل بات نہیں فی صدی دو تین آنے دینے سے یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ غور کیا جائے کہ ہم تک دین جو پہنچا ہے اس کے قائم کرنے کے لئے ہمارے اسلاف نے مال تو کیا اپنی جانیں بھی دے دیں تو کیا ہمارے نزدیک اس کی اتنی بھی قدر نہ ہوگی کہ یہ دو تین آنے دے سکیں۔ اہل اسلام کی نسبت یہ خیال ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ان کو دین کی اتنی بھی قدر نہیں بلکہ اس میں ہم ہی لوگوں کا قصور ہے۔ اگر ہم اسلام کی حالت موجودہ پوری پوری ان کے پیش نظر کردیں اور اشاعت علم کے فوائد اور اس میں کس قدر خدا اور رسول کی خوشنودی ہے ان کے گوش گزار کریں تو پھر دیکھئے کہ کس طرح توجہ ان کی اس طرف مبذول ہوتی ہے۔ اس کام کو انجام دینے کے لئے سردست واعظوں کی ضرورت ہے جو مسلمانوں کے مجمعوں میں جاکر ان کو دین کی حقیقت اور اس کی تائید کی ضرورت پیش نظر کردیں۔ السعی منا والاتمام من اللہ وما توفیقنا الا باللہ ۔

تصوف اور احسان

مولانا مفتی محمد عبد الحمید صاحب شیخ الجامعہ نظامیہ

الحمد للہ وحدہ والصلاۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ وعلی آلہ وجمیع الصحابۃ۔

خلافۃ علی منہاج النبوۃ کا بابرکت دور ختم ہونے کے بعد ملوکیت (بادشاہت) کا دور شروع ہوا اور بہ تدریج للہیت میں کمی اور دنیا داری میں اضافہ ہوتا رہا یہ سلسلہ جاری تھا کہ مغربیت کا مادی سیلاب اٹھا اور جو کچھ دینداری تھی اس کو بھی بہالے گیا۔ علوم دینیہ سے عام طور پر توجہ ہٹ گئی جس کے نتیجہ میں علم گھٹ گیا اور جہل بڑھ گیا۔ اور بسا حقائق، موافق و مخالف جماعتوں کے غلو کی وجہ سے بمصداق "مسلمانان در گور مسلمانی در کتاب" سلف صالحین کے مکتوبات و ملفوظات میں رہ گئے۔ از انجملہ تصوف و صوفی کے الفاظ ہیں کہ موافق گروہ نے اس کی کچھ ایسی تعبیر کی کہ مخالفین نے سرے سے اس کا انکار کر دیا۔ حتی کہ بعضوں نے تصوف کے ڈانڈے فلسفہ سے بلا دئیے اور بعضوں نے تو اس کو ہندو مذہب سے ماخوذ قرار دیا خصوص مسئلہ "وحدۃ الوجود" کی وجہ سے جو ایک دقیق اور وجدانی مسئلہ ہے تصوف اور صوفی کے بارے میں بہت کچھ لکھا اور کہا گیا ہے۔ اس مسئلہ کی آئندہ وضاحت کی جائے گی۔

تصوف تصوف کے ماخذ و مشتقات مختلف بتائے گئے ہیں مگر صحیح یہ ہے کہ یہ "صوف" سے ماخوذ ہے جس کے معنی اون و پشمینہ ہے۔ شریعت میں لباس کی نسبت عام اجازت ہے اِلبس ماشئت، کہ جو چاہو پہنو، اس حکم عام کے ساتھ عدم اسراف و مخیلہ کی قید ہے۔ اسراف کے معنی حد سے تجاوز ہے یعنی حرام یا حد حرام تک نہ پہونچائے۔ اور مخیلہ کا مطلب تکبر و بڑائی کا خیال نہ رہے یعنی لباس کے استعمال میں فخر و کبر کا خیال نہ رہے اور حرمت کی حد تک نہ پہونچے۔ اللہ کے نیک بندے ظاہر و باطن ہر ایک میں حضور کے اسوہ کو پیش نظر رکھتے ہیں، قرآن مجید میں ہے " وما انا من المتکلفین " حضور کا ارشاد ہے میں کسی امر میں بھی تکلف گوارا نہیں کرتا۔ لباس میں بھی حضور نے پر تکلف زرق برق کو پسند نہیں فرمایا، سادہ اور موٹے ڈھالے لباس کو اختیار فرمایا اور اس کی ترغیب بھی دلائی اور اس کی منفعت بھی ظاہر فرمائی چنانچہ ارشاد ہے "علیکم بلباس الصوف تجد وا حلاوۃ الایمان فی قلوبکم" تم اون کا لباس اختیار کرو تو اپنے دلوں میں ایمان کی حلاوت و شیرینی پاؤ گے، اللہ جل شانہ نے نزول وحی کے بعد اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا: "یاایھا المزمل، ویاایھا المدثر" اے کملی اوڑھے ہوئے نبی اٹھئے اور اللہ کے احکام اس کے بندوں کو سنائیے، اور اپنے رب کی عظمت و کبریائی ان کے دل نشین کیجئے، کپڑوں کو پاک و صاف رکھئے، گندگی سے (پہلے کی طرح)

دور رہئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بھی اون کا لباس پسند ہے۔ اسی بنا پر صحابہ کرام زرق برق اور شوخ لباس کے بجائے موٹے ڈھاٹے سادہ لباس ہی کو استعمال فرماتے تھے۔ صحابہ کرامؓ کے بعد ان کے نقش قدم پر چلنے والے بزرگانِ دین نے بھی صوف کے لباس کو اپنے لئے خاص کر لیا جس کی وجہ سے ان کو صوفی سے یاد کیا گیا۔ لیکن اس کی حقیقی وجہ وہ ہے جو حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے بیان فرمائی ہے:۔

من عاش فی ظاھر الرسول فھو سُنی، ومن عاش فی باطن الرسول فھو صوفی۔ رواہ ابونعیم فی الحلیۃ

جو ظاہر رسول پر چلے وہ سُنی ہے۔ اور جو باطن رسول کے مطابق زندگی بسر کرے وہ صوفی ہے۔ (ابونعیم فی الحلیۃ)

ظاہر رسول ظاہر رسول سے مراد رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ شرائع و احکام ہیں اور یہ علم نافع ہے جس کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے اخذ کیا۔ تابعین اور ائمہ سلف نے ان کو سیکھا اور ان پر عمل کیا۔ علم کتاب، سنت، تفسیر، اخبار، فقہ انہی کے توابع ہیں۔

باطن رسول باطنِ رسول سے مراد وہ اسرار ہیں جو علم شرائع اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر عمل کرنے اور اُس کے اصل ماخذ پر واقف ہونے کا نتیجہ ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ظاہر و باطن کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ:۔

حفظت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعائین فاما احدھما فبثثتہ واما الاخر فلو بثثتہ قطع ھذا البلعوم یعنی مجری الطعام (بخاری)

میں نے رسول اللہؐ سے علم کے دو ظرف محفوظ رکھے ہیں ان میں سے ایک کو میں نے لوگوں میں پھیلا دیا ہے، دوسرے کو بھی اگر عام طور پر پھیلا دوں تو میرا حلق کاٹ دیا جائے۔

خواجہ محمد پارسا رحمۃ اللہ علیہ نے فصل الخطاب میں اس حدیث کے یہ معنی لکھا ہے:۔

قالوا المراد بالاول علم الاحکام والاخلاق وبالثانی علم الاسرار

ابوہریرہؓ کے اس قول میں پہلے ظرف سے مراد علم احکام و اخلاق ہے اور دوسرے سے مراد علم اسرار ہے۔

علم احکام و اخلاق پر عمل پیرا ہونے سے علمِ اسرار حاصل ہوتا ہے چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت فرمادی ہے کہ علم سیکھو اور اس پر عمل کرو تو ایک ایسا علم تم کو حاصل ہوگا جس کو تم نے سیکھا نہیں ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ، عبادات، معاملات وغیرہ کا صرف علم حاصل کر لینا کافی نہیں حصولِ علم کا مقصد عمل ہے، اور اس سے معرفت حاصل ہوتی ہے۔ بعض محققین کا قول "حق را شناسی تو یا بی کنز و قدوری" اسی حقیقت کی جانب اشارہ ہے اس سے فقہ یا کتبِ فقہ کی اہمیت کو گھٹانا نہیں ہے، بلکہ عمل کی جانب توجہ دلانا ہے جس سے معرفت کا حصول ہوتا ہے اور یوں بھی امام اعظم ابوحنیفہؒ نے فقہ کی تعریف "معرفۃ النفس مالھا وما علیھا" کی ہے۔

غرض کہ یہ علم ہر شخص کے مجاہدہ و ریاضت، استعداد و صلاحیت کے اعتبار سے عنایت ہوتا ہے جس کا قرآن مجید میں یہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے۔

وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ — اللہ تعالیٰ جس قدر چاہتا ہے اسی قدر علم انہیں حاصل ہوتا ہے۔

اور جو علم خدائے تعالیٰ کی طرف سے کسی کو دیا جاتا ہے وہ ہر وقت و ہر آن حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ اسی حالت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

مشاهدة الابرار بين التجلي والاستتار — ابرار کا مشاہدہ تجلی اور استتار کے بین بین ہوتا ہے۔

تصوف اور صوفی کا حقیقی مفہوم یہی ہے مزید وضاحت کے لئے رسالہ کشف المحجوب کی عبارت ذیل ملاحظہ ہو۔

تصوف را سہ درجہ است یکے متصوف بود کہ برائے جاہ و مال خود را مانند صوفیان حقیقی کند۔ و برائے خوردن و آشامیدن سرگردان شدہ گردد کہ المتصوف عند الصوفية كالذباب وعند غيرهم كالذئاب کہ ہمہ عمر چوں گرگ بطلب مردار باشد۔ دوم متصوف است کہ بے مجاہدہ ایں درجہ طلبد و خود را مانند صوفیا نماید۔

تصوف کے تین درجے ہیں۔ ایک متصوف جو جاہ و مال کے لئے خود کو حقیقی صوفیوں کی طرح بناتا ہے۔ اور کھانے پینے کے لئے سرگرداں رہتا ہے، صوفیہ کے نزدیک ایسا متصوف بناوٹی صوفی مکھی کی طرح ہے اور غیر صوفیہ کے پاس بھیڑیے کے مانند ہے کہ تمام عمر بھیڑیے کی طرح مردار کی تلاش میں رہتا ہے دوسرا درجہ متصوف کا ہے جو مجاہدہ کے بغیر حقیقی تصوف کے مرتبہ کا خواہاں ہوتا ہے اور خود کو صوفیا کی طرح ظاہر کرتا ہے۔

ان دو قسم کے صوفیا اور ان کے اعمال و اقوال کی وجہ سے عام طور پر تصوف کا انکار اور صوفیا کی تحقیر کی جاتی ہے۔ ان کی علامت یہ ہے کہ تصوف کے اصطلاحات کا لوگوں میں پرچار کرتے ہیں اور پرزور بیان سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ ان کے پاس عمل کی کوئی اہمیت نہیں نہ خود عمل کرتے ہیں اور نہ اپنے وابستگان کو عمل کی ترغیب دلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک صرف وحدة الوجود اور دیگر اصطلاحات تصوف کی توضیح و تشریح سب کچھ ہے۔

سوم صوفی حقیقی بود کہ از خود فانی و بحق باقی گردد واز قبضۂ طبائع رستہ بحقائق تصوف پیوستہ باشد صوفی حقیقی کہ بقرب حق تعالیٰ در صف اول باشد و باوصاف امیر المومنین ابو بکر صدیق موصوف گردد" لان الصفا صفة الصديق" آنکہ بطبیعت مصفا باشد و آنکہ مستغرق محبت باشد آنرا صوفی گویند۔

تیسرا درجہ، حقیقی صوفی کا ہے جو اپنی خودی کو مٹا کر حق کے ساتھ باقی رہتا ہے۔ اور طبیعتوں کے قبضہ سے نکل کر حقایق تصوف کے ساتھ مل جاتا ہے۔ حقیقی صوفی قرب حق کی وجہ سے صف اول میں ہوتا ہے اور امیر المومنین ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اوصاف سے متصف ہو جاتا ہے۔ کیونکہ صفائی صدیق کی صفت ہے صدیق وہ ہے جو طبیعت کے اعتبار سے پاک صاف ہو۔ اور جو محبتِ الٰہی میں ڈوب جائے اُس کو صوفی کہتے ہیں۔

صوفی کا باطن، باطنِ رسول کا تابع ہوتا ہے

سابق میں بیان کیا گیا ہے کہ ظاہر رسول پر کاربند سُنّی ہے اور باطنِ رسول کے مطابق زندگی بسر کرنے والا صوفی ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ ظاہر رسول پر عمل پیرا ہوئے بغیر باطن رسول تک رسائی نہیں ہو سکتی تو معلوم ہوا کہ صوفی دونوں کا جامع ہوتا ہے۔ اور چونکہ آنحضرتؐ کا باطن حق تعالیٰ کی صفات کمالیہ کا آئینہ ہے، کوئی وقت ایسا نہیں گزرتا تھا جو یادِ الٰہی سے خالی ہو۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کان خلقہ القرآن (آنحضرتؐ کے اخلاق قرآن کے موافق تھے) سے اسی جانب اشارہ فرمایا ہے چنانچہ صاحب عوارف المعارف لکھتے ہیں:۔

ولا یبعد ان قول عائشة کان خلقه القرآن فیه رمز غامض وایماء خفی الی الاخلاق الربانیة فاحتشمت الحضرة الالٰهیة ان تقول کان متخلقا باخلاق الله تعالیٰ فعبرت عن المعنی بقولها خلقه القرآن استحیاء من سبحات الجلال وسترا للحال بلطف المقال وهذا من وفور عقلها وکمال ادبها۔

یہ امر بعید نہیں کہ بلاشبہ عائشہ صدیقہؓ کے اس قول میں کہ رسول اللہؐ کے اخلاق قرآن کے موافق تھے ایک باریک رمز اور خفی اشارہ خدائی اخلاق کی طرف ہے۔ عائشہؓ نے حضرت کو اخلاقِ الٰہی کا حقیقی مظہر کہنے سے ڈرتے ہوئے اصل حقیقت کو چھپانے کے لئے نہایت خوبی سے اصل مطلب کی اپنے اس قول سے تعبیر کی ہے کہ حضرت کے اخلاق قرآن کے مطابق تھے۔ اور یہ عائشہ صدیقہؓ کے کمال عقل و ادب کی دلیل ہے۔

اسی لئے "فاذکرونی اذکرکم، تم مجھے یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا۔ اور اذکروا الله ذکراً کثیرا" کثرتِ ذکر کا حکم ہوا ہے چونکہ صوفی کا باطن آنحضرتؐ کے باطن کا تابع ہوتا ہے اس لئے صوفیا کے باطنی حالات علیٰ قدر مراتب وہی ہوں گے جو آنحضورؐ کے تھے، ہمیشہ یادِ الٰہی میں مشتغل رہنا اُن کا امتیازی نشان ہے قرآن مجید میں ان کا وصف یہ بیان کیا گیا ہے" رجال لا تلهیهم تجارة ولا بیع عن ذکر الله"۔ چند ایسے مردانِ خدا ہیں جن کو تجارت اور معاملہ ذکرِ الٰہی سے غافل نہیں کرتا۔ ہر حال میں وہ ذکرِ الٰہی میں مشتغل اور احکام الٰہی کے پابند ہوتے ہیں چنانچہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے احوال میں مذکور ہے کہ آپ کا پیشہ تجارت تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے شریکِ تجارت سے فرمایا کہ دیکھو فلاں کپڑے کی تھان میں عیب ہے بوقتِ فروخت خریدار کو آگاہ کر دینا۔ شریکِ تجارت کو بوقتِ فروخت حضرت امام کی یہ ہدایت یاد نہ رہی اور بلا ذکرِ عیب تھان کو فروخت کر دیا۔ امام صاحب کو جب معلوم ہوا تو آپ قیمت فروخت لے کر خریدار کا پتہ معلوم کر کے اُس کے مقامِ سکونت پر پہنچے اور خریدار سے فرمایا کہ فلاں تھان جو تم نے خریدا ہے اس میں یہ عیب ہے اس لحاظ سے اس کی قیمت اس قدر ہوگی اور تم نے جو قیمت دی ہے وہ بہت زاید ہے۔ اب اگر تھان تم کو پسند ہے تو یہ زاید رقم واپس لے لو ورنہ پوری قیمت واپس کی جاتی ہے تھان واپس کر دو۔ خریدار کو امام صاحب کی اس دیانت اور حکم الٰہی کی اس پابندی پر

تعجب ہوا۔ مردانِ خدا کے حالات پر عام طور سے اسی طرح کا اظہار تعجب کیا جاتا رہا ہے۔

حلاوۃِ ایمان

لباس صوف کے استعمال سے حلاوتِ ایمان کا حصول ارشادِ نبوی ہے۔ حلاوۃ (شیرینی) کا مطلب یہ ہے کہ طاعات میں لذت پائے، دینی مشقتوں کو برداشت کرے، اطاعتِ الٰہی اور ترک مخالفت سے بندہ اللہ و رسول سے محبت رکھے، اور فانی دُنیا پر دینی مشقتوں کو ترجیح دے۔ اور یہ کیفیت یعنی حلاوتِ ایمان، محسوس بھی ہے اور معنوی بھی۔ چنانچہ حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو کفر کی جانب لوٹنے پر جبر کرتے ہوئے اقسام کی سزائیں اور اذیتیں دی گئیں تو آپ نے احدٌ احدٌ یعنی اللہ ایک ہے ایک ہے کہا۔ اس طرح آپ نے عذاب کی تلخی کے ساتھ ایمان کی شیرینی کو ملا دیا۔ آپ کے انتقال کے وقت اہل خانہ نے وَاکَرْبَاہ، ہائے بیقراری کہا۔ اور حضرت بلالؓ نے فرمایا وَاطَرْبَاہ فرمایا یعنی واہ مسرت و شادمانی کہ کل میرے احباب (حضور محمدؐ اور آپ کے اصحابؓ) سے ملاقات ہوگی۔ اس طرح موت کی تلخی کے ساتھ ملاقات احباب کی شیرینی کو ملا دیا۔ یہی ایمان کی حلاوت ہے کہ امراض، غفلت و خواہشات سے محفوظ قلب ایمان کے مزے سے لذت اندوز ہوتا ہے جس طرح کہ نفس شہد وغیرہ کی شیرینی سے لذت پاتا ہے۔ حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کی وضاحت فرمائی۔

ثلاث من کن فیہ وجد حلاوۃ الایمان۔ من کان اللہ و رسولہ احب الیہ مما سواھما ومن احب عبدا لا یحبہ الا للہ ومن یکرہ ان یعود فی الکفر بعد اذ انقذہ اللہ کما یکرہ ان یلقیٰ فی النار۔ (بخاری)

تین چیزیں جس شخص میں ہوں وہ ایمان کی حلاوت کو پا لیا جس کے پاس اللہ و رسول سب سے زیادہ محبوب ہوں اور جو کسی بندہ کو محض اللہ کے لئے محبوب رکھے (ذاتی کوئی منفعت نہ ہو) اور جو کفر سے بچائے جانے کے بعد دوبارہ کفر کی طرف لوٹنے کو اس طرح ناپسند کرے جس طرح آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند سمجھتا ہے۔ (بخاری شریف)

لباسِ صوف کے اختیار سے یہ حلاوت جو نعمت عظمیٰ ہے حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ اس لباس کا اختیار خود اس امر کی دلیل ہے کہ صوفی۔ فانی دُنیا سے روگردان اور حق تعالیٰ کی جانب یکسوئی کے ساتھ متوجہ ہے اور یہ اُس کے حبِ الٰہی کی کھلی نشانی ہے۔ چنانچہ متاخرین صوفیا نے موٹی چادر اور موٹے ازار کو سیاہ یا گیرو سے رنگ کر استعمال فرمایا کہ لباس کو بار بار دھونے اور بدلنے کی نوبت کم آئے۔ اس ظاہری سادہ لباس کے ساتھ اُن کا باطن بھی متقدمین کی طرح پاک صاف رہا کرتا تھا اور یہی صوفی کی امتیازی شان اور خصوصی نشانی ہے۔ شیخ ابو علی رودباری کا قول ہے:-

الصوفی من لبس الصوف علی الصفا۔ واذاق الھوی طعم الجفا ولزم طریق المصطفیٰ وکانت الدنیا منہ علی القفا۔

صوفی وہ ہے جو قلب کی صفائی و پاکیزگی کے ساتھ لباس صوف اختیار کرے۔ اور خواہشاتِ نفس کو سختی اور تکلیف کا مزہ چکھائے۔ اور مصطفیٰؐ کے طریقے کو لازم کر لے اور دُنیا کو پسِ پشت ڈال دے۔

درستگی و پاکیزگیٔ قلب کے بغیر صوف یا اُس کا متبادل موٹا لباس استعمال کیا جائے تو صوفیا کے نزدیک ایسا لباس چوپایوں کا ہے۔ صاحب کشف المحجوب فرماتے ہیں:-

الصفا من اللہ انعام و اکرام و الصوف لباس الانعام۔ صفائیٔ قلب و تزکیہ نفس اللہ کا انعام و اکرام ہے اور صوف انعام (چوپایوں) کا لباس ہے۔

موجودہ دور موجودہ دور میں بموجب پیشین گوئی "لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ" تم ضرور اپنے پیش رو (یہود و نصاریٰ) کے قدم بہ قدم چلوگے، اکثر علما، مشائخین، عوام کا قول و فعل بعینہ ویسا ہی ہے جیسے اہلِ کتاب کا رہا ہے۔ عبادات کی بجائے خواہشات پر عمل ہے۔

"فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلاۃ واتبعوا الشھوات"۔ اُن صالحین کے بعد برے جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات کے پیچھے جاتے رہے۔ اسلاف نے زرق برق لباس کو چھوڑ کر خواہشِ نفس کے خلاف جو صوف کا لباس اختیار فرمایا تھا اخلاف نے اُس کو اور اُس کے متبادل لباس کو محض خواہشِ نفس کے مطابق اختیار کیا۔ اور اصل عمل کو ترک کر دیا، اخلاف کی اس روش کو دیکھ کر بعض بزرگوں نے متنبہ کیا کہ "در عمل کوش، ہر کہ خواہی پوش" یعنی اصل عمل ہے، لباس نہیں۔ صرف درویش صورت بنانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر سادہ لوح ظاہری نسبت کو دیکھ کر ان کی جانب راغب ہوتے ہیں اور دوسرے لوگ درویش صفت کے بغیر درویش صورت سے متنفر ہیں۔ حضرت شیخ سعدیؒ نے اسی کی تصویر کھینچی ہے:-

دلقت بچہ کار آید و تسبیح و مرقع ۔۔۔ خود را ز عملہائے نکوہیدہ بری دار

حاجت بکلاہ برکی داشتنت نیست ۔۔۔ درویش صفت باش و کلاہ تتری دار

مگر ان نصائح کے باوجود، بمضمون "لا یبقی من الاسلام الا اسمہ ولا یبقی من القرآن الا رسمہ" اس وقت اسلام کا نام اور قرآن کا رسم رہ گیا ہے (انا للہ وانا الیہ راجعون) البتہ ہر زمانے میں تا قیام ساعت ایک جماعت حق پر قائم و دائم رہے گی۔ امام مالکؒ نے سچ فرمایا کہ "لن یصلح اخر ھذہ الامۃ الا ما صلح بہ الاول" یعنی پچھلی امت کی اصلاح و درستگی بھی اُسی طریقے سے ہوگی جس طریقے سے اگلی امت کی اصلاح ہوئی ہے۔ الحاصل صوفیا ظاہر و باطن ہر دو کے جامع ہوتے ہیں اور اپنے مجاہدہ و ریاضت کی وجہ سے "مقامِ احسان" پر فائز ہوتے ہیں جو مقام مشاہدہ و مراقبہ ہے جس کی وضاحت حدیثِ جبرئیل میں ہے،

حدیثِ جبرئیل مسلم شریف میں حضرت فاروق اعظمؓ سے مروی ہے کہ "ایک بار ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت بابرکت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص آیا جس کا لباس نہایت سفید، صاف، ستھرا اور بال نہایت سیاہ تھے، سفر کا اُس پر کوئی اثر نہ تھا اور ہم میں سے کوئی شخص اُس کو پہچانتا بھی نہیں تھا حضورؐ کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گیا اور دونوں زانو پر ہاتھ رکھ کر کہا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

مجھے خبر دیجئے کہ اسلام کیا چیز ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا " اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔ نماز پڑھو، زکواۃ دو، رمضان کے روزے رکھو، اور قدرت ہو تو حج کرو " کہا آپ سچ کہتے ہیں۔ ہم کو تعجب ہوا کہ سوال بھی کرتا ہے (جو لاعلمی کی دلیل ہے) اور خود ہی تصدیق بھی کرتا ہے (جو علم ہونے کی دلیل ہے) پھر کہا یہ بتایئے کہ ایمان کیا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا " خدائے تعالیٰ کی ذات، ملائکہ، اُس کی کتابوں، پیغمبروں پر ایمان لانا اور خیر و شر کو اللہ ہی کی طرف سے سمجھنا، ایمان ہے " کہا آپ سچ کہتے ہیں۔ پھر کہا یہ بتایئے کہ احسان کیا چیز ہے؟ فرمایا " اللہ جل شانہ کی اس طرح عبادت کرنا کہ گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم نہیں دیکھتے تو وہ تو دیکھ رہا ہے " کہا آپ سچ کہتے ہیں۔ پھر اُس نے قیامت کے حالات دریافت کئے۔ جب وہ شخص چلا گیا تو حضرتؐ نے پوچھا اے عمر تم جانتے ہو کہ یہ کون ہے؟ میں نے کہا اللہ و رسول داناترہیں۔ فرمایا وہ جبرئیل تھے تم کو دین کی تعلیم دینے کے لئے آئے تھے "

حدیثِ مذکور میں احسان کو " انتہائی مرتبہ " بیان کیا گیا ہے جس کا حصول اسلام و ایمان پر موقوف ہے۔ اسلام و ایمان کے بغیر احسان کا مرتبہ حاصل ہی نہیں ہوسکتا۔

اسلام اسلام، ظاہر احکام کے بجالانے کا نام ہے، زبان سے توحید و رسالت کا اقرار، اعضا سے نماز، زکواۃ، روزہ اور حج کی ادائی ہے۔ ان احکام ظاہری کے بجالانے میں جس کا دل تنگ ہو تو اُس کو ہدایت کا راستہ ہی نہیں ملتا چنانچہ ارشاد ہے :-

فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام ومن یرد ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقا حرجا کانما یصعد فی السماء۔

جس کی ہدایت کا اللہ ارادہ کرتا ہے تو اُس کے سینہ کو کھول دیتا ہے اور جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے تو اُس کے سینہ کو تنگ کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے۔

اس نص قطعی سے ثابت ہے کہ جس پر عبادت ظاہر آسان نہ ہو تو یہ سمجھا جائے گا کہ خدائے تعالیٰ اُس کو گمراہی میں چھوڑ دینا چاہتا ہے اور جس کو اللہ گمراہی میں چھوڑ دے تو ممکن نہیں کہ اُس کو ہدایت اور تقرب الٰہی حاصل ہوسکے لہذا کوئی تصوف کا نام لے کر اور صوفی کہلا کر یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ احکام ظاہری کے بجالانے کی ضرورت نہیں اس کے بغیر ہی وہ انتہائی درجہ پر فائز ہے۔ تصوف تو ان ہر سہ مراتب پر کامل عمل پیرائی کا نام ہے، پس جو عبادتِ مفروضہ سے محروم ہے وہ درجہ احسان کے قریب بھی نہیں آسکتا کیونکہ احسان میں عبادت کی ادائی اعلیٰ یکسوئی خضوع و خشوع کے ساتھ ہے۔ حدیث جبرئیل سے دین میں ابتدائی درجہ اسلام ہے جس کے بغیر کوئی شخص مسلم ہی نہیں کہلاسکتا۔ احسان تو اُس کا انتہائی مرتبہ ہے ابتدائی درجہ کا وجود دوسرے دونوں درجوں میں ضروریات سے ہے، کیونکہ ایمان کے درجہ میں ذات الٰہی، پیغمبروں اور کتابوں پر ایمان لانا ہے۔ اور ان پر اسی طرح ایمان لانا ضروری ہے، جو قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ ان کے بغیر خود کوئی شخص کسی بات پر ایمان لائے تو اُس کا اعتبار نہیں۔ یعنی دین کے

جملہ مدارج میں خدا اور رسول کی اطاعت وفرمانبرداری ضروریات سے ہے ان میں سے کسی کا بھی انکار ایمان کے منافی ہے۔

احسان احسان کیا چیز ہے کے جواب میں حضورؐ نے دو حالتوں کی جانب اشارہ فرمایا۔ مشاہدہ حق، ۲ مراقبہ حق۔ پہلی حالت بلند تر ہے کہ اس میں عابد پر مشاہدہ کا غلبہ ہوتا ہے حتی کہ وہ گویا اپنی آنکھ سے حق کو دیکھتا ہے، کانک تراہ کی دوسری حالت میں اس امر کا استحضار ہے کہ حق اس پر مطلع ہے اُس کے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے (فانہ یراک) ان دونوں حالتوں کا ثمرہ اللہ کی معرفت اور اس سے خشیت ہے چنانچہ عمارہ بن قعقاع نے اپنی روایت میں اُن تخشی اللہ کانک تراہ' سے تعبیر کی ہے۔ **مقصودِ کلام** 'عبادات میں اخلاص پیدا کرنے کی ترغیب ہے اور اس پر اکسانا ہے کہ کمال خشوع وخضوع کے ساتھ عبد اپنے رب کا مراقبہ کرے۔ اہلِ حقائق نے صالحین کی صحبت اختیار کرنے پر زور دیا ہے تاکہ اُن کے احترام اور اُن سے حیا کرتے ہوئے کسی نقص سے ملتبس نہ ہوں تو پھر ایسی ذات کی جناب میں حاضری جو بندے کے ظاہر وباطن سرّ وعلانیہ پر مطلع ہے، کسی اور جانب توجہ کیونکر ہو سکے گی۔ حضورؐ کے ارشاد کا خلاصہ مطلب یہ ہوا کہ ادائے عبادت کے وقت اُن تمام مذکورہ آداب وخشوع، خضوع، یکسوئی کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے اس لئے کہ وہ بہر حالت ہمیشہ تجھ کو دیکھ رہا ہے اور تیرے ہر عمل سے باخبر ہے۔ حضور پرُنور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: اوتیت جوامع الکلم۔ مجھے جامع کلمات دیئے گئے ہیں یعنی ہر کلمے میں معانی کا سمندر ہے۔ حضورؐ کا ارشاد: ان لم تکن تراہ فانہ یراک بھی منجملہ جوامع کلمات کے ہے۔ اس میں مقام شہادۃ ومقام مراقبہ دونوں موجود ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ بندے کے لئے اس کی عبادت میں تین مقام ہیں۔

مقام اوّل: یہ ہے کہ جملہ ارکان وشرائط کی ادائی کے ساتھ اس طریقہ پر عبادت ادا کرے کہ وظیفۂ تکلیف ساقط ہو جائے۔

مقامِ دوّم حسب صراحت مذکور ادائے عبادت کے ساتھ بحرِ مکاشفہ میں اس طرح مستغرق ہو جائے کہ گویا وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ یہ آنحضورؐ کا مقام عالی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوۃ۔ میرے آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔ کیونکہ طاعت سے لذت اور عبادت سے راحت ملتی ہے۔ اور انوار کشف کے احاطہ وغلبہ کی وجہ سے، غیر کی جانب توجہ والتفات کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور یہ گوشہ ہائے قلب، محبوب سے لبریز ہونے کا ثمرہ ہے۔ اور اس کا نتیجہ احوال معلوم سے فراموشی اور رسوم سے بے خودی ہے۔

مقامِ ثالث: اس طرح عبادت کی جائے کہ اس پر یہ حال غالب ہو کہ اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ یہ مقام مراقبہ ہے، ارشادِ نبوی: ان لم تکن تراہ۔ مقام مکاشفہ سے مقام مراقبہ کی جانب نزول ہے۔ یعنی اگر تو اہلِ رویتِ معنویہ کی طرح عبادت نہیں کر سکتا تو اس طرح عبادت کر کہ وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے یہ ہر سہ مقامات، احسان کے مقامات ہیں مگر پہلا مقام صحت عبادت کی شرط ہے۔ بقیہ دو مقام، خواص کے ہیں

جن تک بہت سے لوگوں کی رسائی دشوار ہے۔ صوفیا علی حسب مراتب، کسی نہ کسی مرتبہ پر فائز رہتے ہیں دوسروں کو بھی اسی کی تاکید کرتے ہیں تمہیدات عین القضاۃ میں ہے :-

نماز اعظم العبادات است زنہار تا بعادت نگزاری وسر اعظم در نماز، خضوع در تن خشوع در قلب بر نخوانے والذین ھم فی صلاتھم خاشعون نماز بے خشوع وخضوع چوں قالب بے روح است و رستگاری مومنان در نماز با خشوع است۔ قال اللہ تعالیٰ قد افلح المومنون الذین ھم فی صلاتھم خاشعون ۔

نماز بزرگ ترین عبادت ہے۔ ہرگز نماز کو بطور عادت ادا نہ کرو نماز کا سر اعظم جسم میں خشوع (ڈھیلا پن) اور قلب میں خشوع (عاجزی و شکستگی) ہے بمضمون والذین ھم فی صلوٰتھم خاشعون خشوع وخضوع کے بغیر نماز، بے جان ڈھانچہ ہے، مسلمانوں کی نجات نماز میں خشوع سے ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وہ مومن نجات پا گئے جو اپنی نمازوں میں فروتنی برتتے ہیں۔

سلطان ابراہیم ادھم کا قول ہے :

ہر کہ دل خود را در نماز حاضر نیابد یقین داند کہ در ہدایت براو بستہ اند (رسالہ کشف المحجوب)

جو شخص نماز میں اپنے دل کو حاضر نہ پائے اس کو یقین رکھنا چاہیے کہ راہ ہدایت اس پر بند کر دیا گیا ہے۔

وہ لوگ جو ادعائے تصوف کے ساتھ نماز و روزہ کو غیر اہم سمجھتے ہیں اور اپنے مریدین و معتقدین کو بھی یہ باور کراتے ہیں کہ یہ اعمال علمائے ظاہر کے لئے ہیں۔ غور کریں کہ وہ گمراہی کی کس وادی میں اتر گئے ہیں اور شیطان اُن پر کس طرح مسلط ہو گیا ہے اعاذنا اللہ منہ ۔

وحدۃ الوجود

جن لوگوں کے پاس عبادات خصوصاً نماز کی کوئی اہمیت نہیں۔ ان کا زیادہ تر مشغلہ وحدۃ الوجود پر بحث و گفتگو ہے۔ حالانکہ یہ مسئلہ عوام میں گفتگو کئے جانے کا ہے ہی نہیں۔ عرفا و مصلحائے اُمت نے عوام کے سامنے اس مسئلہ پر گفتگو سے سخت ممانعت کی ہے کہ یہ ان کے فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ اس پر ایک سرسری اور واضح عام فہم عبارت میں روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔ قرآن حکیم میں ہے : ھل اتیٰ علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئاً مذکورا۔ انسان پر زمانہ کا ایک ایسا وقت بھی تھا کہ وہ اس میں شی مذکور نہ تھا۔ ارشادِ نبوی ہے : کان اللہ ولم یکن معہ شی ۔ اللہ تبارک و تعالیٰ تھا اور اس کے ساتھ کوئی شئے نہ تھی۔ یعنی تمام کائنات معدوم تھی، جب حق تعالیٰ کا ارادہ اپنی معرفت کا ہوا تو اشیا پر اپنے وجود کا پرتو ڈالا جس کی وجہ سے اشیا محسوس ہوئیں۔ وجود، حق تعالیٰ کی صفت ہے، اسی طرح علم بھی اس کی ایک صفت ہے اور اسی صفت علم میں جملہ اشیا موجود ہونے سے پہلے ثابت تھے۔ اسی لئے ان اشیا کو "اعیان ثابتہ" کہا جاتا ہے۔ ان پر وجود کی تجلی ہوئی تو وہ وجود میں آئے اور موجودات کہلائے ان تمام موجودات کا وجود ایک ہے، البتہ ہر موجود میں دو چیزیں پائی جائیں گی ایک وجود جو شئی کا نہیں موجد کا ہے دوسری اُس کی عین ثابت، لہٰذا کثرت

اعیان ثابتہ میں ہے وجود میں نہیں۔ تو اب معلوم ہوا کہ تمام موجودات کا وجود ایک ہی ہے اور اسی کا نام وحدۃ الوجود ہے۔ اس کو مختلف عبارتوں سے تعبیر کیا گیا ہے

مراتب توحید

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے کیمیائے سعادت میں تحریر فرمایا ہے کہ:

اعلم ان التوحید علی اربع مراتب الاولی ان یقول لا الٰہ الا اللہ باللسان وقلبہ غافل عنہ او منکر لہ۔ کتوحید المنافق ۔ الثانیۃ ان یصدق بمعنی اللفظ قلبہ کما یصدق بہ عموم المسلمین۔ وھو اعتقادہ ۔ والثالثۃ ان یشاھد ذلک بطریق الکشف بواسطۃ نور الحق وھو مقام المقربین وھو ان یری اشیاء کثیرۃ لکن یراھا صادرۃ من الوحدۃ ۔ والرابع ۔ ان لا یری فی الوجود الا واحدۃ وھو مشاھدۃ الصدیقین ۔

توحید کے چار درجے ہیں ۔ پہلے درجے میں صرف زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں جیسے منافق کی توحید، کہ دل توحید کا منکر ہے ۔ دوسرا درجہ توحید کا وہ ہے جس میں زبان سے اقرار کے سوا دل سے بھی تصدیق کرے، عام مسلمانوں کا یہی اعتقاد ہے (اور شرع میں اس کا اعتبار ہے) تیسرا درجہ توحید کا یہ ہے کہ اعتقاد کے علاوہ مکاشفہ سے بھی توحید کا مقام واسطۂ نور حق مشاہدہ کرے ۔ یہ مقربین کا مقام ہے اس مقام پر ظاہر میں بہت اشیا نظر آتے ہیں لیکن وہ وحدت سے صادر دیکھتا ہے ۔ چوتھا درجہ توحید کا یہ ہے کہ بجز ایک ذات کے جس کا وجود حقیقی ہے کچھ اور نہ دیکھے۔ یہ صدیقین کا مشاہدہ ہے کیونکہ جس کی نعم بصیرت حق بیں ہو اُس کی نظر عکسی اور ظلی وجود پر نہیں پڑتی۔

خلاصہ کلام یہ کہ وجود حقیقی ایک ہے اس کے سوا جو کچھ ہے وہ عدم ہے (کل شیئ ھالک الا وجھہ) مگر اس حقیقت تک رسائی کے لئے دو امر ضروری ہیں۔ ایک تصفیۂ قلب کہ دل کو ماسوی اللہ سے تعلق نہ رہے اور طالب عاشق ذکر الٰہی میں ایسا مصروف ہو کہ خود کو بھول جائے اور دوام حضور حاصل ہو۔ دوسرا تزکیۂ نفس یعنی اخلاقِ رذیلہ اور عاداتِ قبیحہ سے نفس پاک ہو جائے اور یہ ہر دو امر تصفیہ و تزکیہ ریاضت شاقہ اور مجاہدہ کاملہ پر موقوف ہیں جن سے مشاہدہ حاصل ہوتا ہے، اور اس میں شرط لازم شرع شریف کی کمال اتباع ہے۔ اللہ جل شانہ نے جن وانس کی تخلیق کا اصل مقصد معرفت الٰہ قرار دیا ہے۔

مقصد تخلیق جن وانس

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ۔ میں نے جن وانس کو عبادت ہی کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ عبادت حسب تعلیم جبرئیل علیہ السلام احسان کے ساتھ ادا ہونا چاہئے، اسی لئے خیر اُمت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے لیعبدون کی تفسیر 'لیعرفون' سے کی ہے یعنی عبادت اس طرح سے ادا کی جائے کہ معرفتِ رب حاصل ہو۔ عارفین حق نہ صرف عبادات مفروضہ کو نہایت اہتمام سے ادا کرتے ہیں بلکہ مستحبات خصوصاً نماز تہجد کی پابندی فرماتے ہیں اور نوافل سے اتنا قرب حاصل ہوتا ہے کہ بموجب حدیث قرب اللہ بندہ کا دست وپا اور چشم و گوش ہو جاتا ہے ۔ واللہ یھدی من یشآء الی صراط مستقیم۔

علم کی افادیت اور اس کا ماضی و حال سے تقابل

مولانا سید شہ حسن احمد صاحب شطاری
رکن مجلس انتظامی جامعہ نظامیہ
و معتمد مجلس علمائے دکن

ساری دنیا اس کی معترف ہے کہ علم سے عقلِ انسانی کو روشنی ملتی ہے اور فکر و نظر کی فطری صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ عقل کی دو قسمیں ہیں عقلِ سلیم اور عقلِ فاسد۔ جس کو جیسی عقل ملتی ہے وہی پروان چڑھتی ہے۔ حضرت سعدیؒ نے کیا خوب فرمایا ہے

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست ۔ در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

یہی وجہ تھی کہ جس زمانے میں حکومتی مدارس نہ تھے اور علمائے وقت اپنے اپنے گھروں پر درس دیا کرتے تھے تو تلامذہ کی جبلت کا اندازہ لگانے کے بعد صرف بقدرِ ظرف ان کی علمی تشنگی دور کی جاتی تھی تاکہ علم جیسی دولت سے استفادہ کی بجائے کوئی استحصال نہ کرپائے۔ لیکن اس کا ایک منفی پہلو یہ بھی تھا کہ کتنے ہی بہترین طبعی صلاحیتیں رکھنے والے بھی حصولِ علم کے ناسازگار ماحول یا اساتذہ کے اولاً کس کم دیکھنے کی تاب نہ لاسکنے کے سبب محروم علم رہے اور جہالت کی تاریکی ملکہ سے کماحقہٗ دور نہ ہوسکی تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دورِ ماضی میں جتنے افراد زیورِ علم سے آراستہ ہوکر نکلے ان کی ٹھوس قابلیت کی ایک بھی مثال آج مشکل ہی سے ملے گی۔

علم کی افادیت میں طلبا کی اطاعت کیشی اور قابل اساتذہ کی شفقت سے چار چاند لگ جاتے ہیں۔ لیکن جس موجودہ فضا میں طالبانِ علوم و فنون سانس لے رہے ہیں وہ اساتذہ کی عظمت کے حقیقی تصور سے یکسر خالی ہے تو پھر جس طالب علم کے دل میں اُستاد کی عظمت نہ ہو وہ اس کی شفقت کس طرح حاصل کرسکتا ہے۔ اسی لئے دورِ حاضر میں عظمت و شفقت کے فقدان نے علم کی افادیت کو بہت کچھ گھٹا دیا ہے مزید برآں جب کسی طبعی کمزوری کے سبب علم اس کی عقلِ فاسد کو ہوا دیتا ہے تو "کڑوا کریلا نیم چڑھا" کی کہاوت صادق آنے لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ساری دُنیا شر و فساد کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے یہاں تک اس حوصلہ شکن معاشی بحران اور اشیائے مایحتاج کی گرانی میں آئے دن روز افزوں حیرت ناک اضافوں کے باوجود اگر کوئی چیز سب سے سستی بلکہ بے قیمت ہے تو وہ انسانیت کا احترام اور اس کا بے دریغ خون ہے۔ جس میں امن کے علم بردار ہونے کے مدعی بھی "شریک دزد و ہمراہ قافلہ" نظر آتے ہیں۔ سائنس کی معراج نے تعمیر کی بجائے تخریب کی نت نئی راہیں کھول دی ہیں، لسانی تقسیم، رنگ و نسل کا امتیاز اور جغرافیائی حد بندیاں، یہ وہ لعنتیں ہیں جو عقلِ فاسد ہی کی پیداوار ہیں لیکن ان پر نہ معلوم کتنے مفکرین اور سیاست کے طوفان خیز سمندر سے بزعمِ خود پار اتارنے والے ناخدایان

سفینۂ انسانیت کو بڑا فخر ہے۔ بقول لسان الغیب علیہ الرحمۃ ؎

این چہ شوریست کہ در دورِ قمر می بینم | ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم
دختراں را ہمہ جنگ است و جدل با مادر | پسراں را ہمہ بدخواہ پدر می بینم
اسپ تازی شدہ مجروح بہ زیر پالاں | طوقِ زرین ہمہ در گردنِ خر می بینم

تاہم کوئی دور بھی صحیح فکر و نظر رکھنے والوں سے خالی نہیں رہا۔ یہ بات اور ہے کہ اچھی صلاحیتیں رکھنے والے اخلاص پیکر اتنے گنے چنے رہ گئے کہ فی زمانہ اُن کا پرسنٹیج نکالنا ایک ماہرِ ریاضی کا بھی مزاج ہی تو پوچھ لے گا۔ شاید کسی ایسے ہی ماحول کے تاثر نے شکیل بدایونی سے یہ شعر کہلوا دیا ؎

اس درجہ بدگماں ہیں خلوصِ بشر سے ہم | اپنوں کو دیکھتے ہیں پرائی نظر سے ہم

یہاں تک تو مطلق علم اور اُس کی افادیت کا سطورِ بالا میں ایک ہلکا سا جائزہ لیا گیا اب ذرا علمِ دین کے تعلق سے بھی جس کا ماخذ کلامِ الٰہی ہے اس پر اُچٹتی ہوئی ہی سہی تقابلی نظر ڈالیے تو اس کی سب سے پہلی افادیت تو یہی معلوم ہوگی کہ وہ انسان کو اپنے خالق، الٰہ اور رب کا مکمل تصور دیتا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ ہر انسان کو اُس کے آگے جواب دہ ہونا ہے جس کے بعد وہ اپنے اعمال کی بنیاد پر مستحق جزا یا مستوجب سزا ہوتا ہے۔ یہ وہ اوّلین زینہ ہے جس پر قدم دھرتے ہی عقلِ فاسد کا جنازہ نکل جاتا ہے اور اُس کی جگہ عقلِ سلیم خود بخود لے لیتی ہے۔ اس مقام پر بعض ہمدرد مفکرین کا یہ خیال کہ صرف علومِ دینیہ کا اکتساب کرنے والا کسی مسجد کا خطیب و امام، کسی دینی درس گاہ کا مدرس یا کسی مسلح کا ملّا بن کر رہ جائے تو رہ جائے مگر علومِ جدیدہ کی سابقتی زندگی میں اُس کا کوئی مقام نہیں، بظاہر بڑا معقول اور مشاہداتی معلوم ہوتا ہے۔ اِن ہمدردوں کی دیانت اور اُن کا اخلاص غیر مشتبہ ہونے کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ جتنی نظر اُتنی بات۔ قرآنِ حکیم جو علومِ دینیہ ہی نہیں بلکہ سارے علوم و فنون کا سرچشمہ، منبع اور ماخذ ہے یا تو اُس کو انھوں نے پڑھا نہیں یا پڑھا بھی تو اُس میں فکر و نظر نہیں کی۔ وہ وقت کے تقاضوں سے مطابقت پیدا کرنے کا سلیقہ تو سکھاتا ہے لیکن ابن الوقت بن کر اُن میں اپنے آپ کو ضم اور مدغم کر دینے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کو سمجھنا ہو تو مدینۃ العلمؐ کی عطا کردہ فکر و نظر سے سمجھو، بابِ مدینۃ العلمؑ کا اندازِ فکر صحیح رہبری کر سکے گا۔ صحابۂ کرامؓ کی عملی زندگی راستہ دکھائے گی، اہلِ بیتِ اطہارؑ کی سوجھ بوجھ حقایق سے پردہ اُٹھائے گی اور ائمۂ شریعتؒ علمائے ملتؒ و صلحائے اُمتؒ کی پیروی بصیرت افروز ہوگی۔ لیکن ان سب کو چھوڑ کر اگر کوئی بدنصیب مستشرقینِ یورپ کے دماغی اُپج کی دھندھلک سے روشنی حاصل کرنا چاہے گا تو خود بھی اندھیرے میں رہے گا اور دوسروں کو بھی تاریکی میں ڈال دے گا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قرآن نے دُنیا کو بھی دین بنا کر لے چلنے کی تعلیم دی اور دورِ حاضر کا محروم علمِ دین، دین کو بھی دُنیا کے معیار پر جانچنا چاہتا ہے۔

مذکورہ بالا طریقے سے اگر قرآن کو سمجھ کر کسی سے پڑھو تو معلوم ہوگا کہ منطق (لاجک) فلسفہ (فلاسفی) علم تمدن و معاشرت (سوشیالوجی) حیاتیات (بیالوجی) علم حیوانات (زوالوجی) علم ترکیب اجسام حیوانات (فیشیالوجی) علم نباتات (باٹونی) علم طبقات الارض (جیالوجی) علم فلکیات (ایسٹرانومی) علم حرارت (پیرالوجی) طبعیات (فزکس) کیمیا (کیمسٹری) کیا کچھ اس میں نہیں اور کتنے ہی علوم کے تعلق سے اس نے ریسرچ کی دعوت نہیں دی۔

مشتے نمونہ از خروارے یہاں چند آیتیں دعوتِ فکر و نظر کے تعلق سے درج ذیل ہیں:۔

(۱) إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۚ پارہ (۴) سورہ آل عمران ع (۲۰)

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں دلائل ہیں اہلِ عقل کے لئے۔

(۲) اُنْظُرُوْا اِلٰی ثَمَرِهٖ اِذَا اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ پارہ (۷) سورہ انعام ع (۱۲)

ہر ایک کے پھل کو تو دیکھو جب وہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے کو دیکھو۔ ان میں دلائل ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں۔

(۳) وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ۭ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَاۗءٍ وَّاحِدٍ ۣ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰي بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ پارہ (۱۳) سورہ رعد ع (۱)

اور وہ ایسا ہے کہ اس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور نہریں پیدا کیں اور اس میں ہر قسم کے پھلوں سے دو دو قسم کے پیدا کئے۔ شب سے دن کو چھپا دیا۔ ان امور میں سوچنے والوں کے لئے دلائل ہیں۔ اور زمین میں پاس پاس مختلف قطعے ہیں اور انگوروں کے باغ ہیں اور کھیتیاں ہیں کھجوریں ہیں جن میں بعضے تو ایسی ہیں کہ ایک تنہ سے اوپر جا کر دو تنے ہو جاتے ہیں اور بعضے میں دو تنے نہیں ہوتے۔ سب کو ایک ہی طرح کا پانی دیا جاتا ہے اور ہم ایک کو دوسرے پر پھلوں میں فوقیت دیتے ہیں۔ ان امور میں سمجھداروں کے واسطے دلائل ہیں۔

(۴) اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ۭ

کیا ان کے لئے یہ امر موجب رہنمائی نہیں ہوا کہ ہم ان سے پہلے کتنی امتیں ہلاک کر چکے ہیں جن کی سکونت گاہوں میں یہ لوگ آتے جاتے ہیں اس میں صاف

اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ ۝ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا
نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ
فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ
وَاَنْفُسُهُمْ ؕ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ۝

پارہ (۲۱) سورہ سجدہ ع (۳)

(۵) وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى
الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝

پارہ (۲۵) سورہ جاثیہ ع (۲)

(۶) اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ
اَقْفَالُهَا ۝ پارہ (۲۶) سورہ محمد ع (۳)

(۷) اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ
كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ
فُرُوْجٍ ۝ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا
فِيْهَا رَوَاسِىَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ
زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى
لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝

پارہ (۲۶) سورہ ق ع (۱)

(۸) فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ
مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ
الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۝ اِنَّهٗ عَلٰى
رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ۝

پارہ (۳۰) سورہ طارق ع (۱)

(۹) وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۝
لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۝ وَّجَنّٰتٍ
اَلْفَافًا ۝ پارہ (۳۰) سورہ نباء ع (۱)

نشانیاں ہیں۔ کیا یہ لوگ سنتے نہیں ہیں؟ کیا انھوں
نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ ہم خشک افتادہ زمین
کی طرف پانی پہنچاتے ہیں پھر اس کے ذریعے سے کھیتی
پیدا کرتے ہیں جس سے ان کے مویشی اور وہ خود بھی
کھاتے ہیں۔ تو کیا دیکھتے نہیں ہیں؟

اور جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جتنی چیزیں زمین
میں ہیں ان سب کو تمھارا تابع بنایا۔ بیشک ان باتوں
میں ان لوگوں کے لئے دلائل ہیں جو غور کرتے رہتے ہیں۔

تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر
قفل لگ رہے ہیں؟

کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر کی طرف آسمان کو نہیں
دیکھا کہ ہم نے اس کو کیسا بنایا اور اس کو آراستہ
کیا اور اس میں کوئی رخنہ تک نہیں۔ اور زمین کو
ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑوں کو جما دیا اور
اس میں ہر قسم کی خوشنما چیزیں اگائیں جو ذریعہ
ہے بینائی اور دانائی کا ہر رجوع ہونے والے بندے
کے لئے۔

تو انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا
گیا ہے؟ وہ ایک اچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو
پشت اور سینہ کے درمیان سے نکلتا ہے۔ وہ اس
کے دوبارہ پیدا کرنے پر ضرور قادر ہے۔

اور ہم ہی نے بھرے بادلوں سے بکثرت پانی برسایا
تاکہ ہم اس پانی کے ذریعے سے غلّہ اور سبزی اور
گنجان باغ پیدا کریں۔

(۱۰) اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ۝ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ۝ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ۝ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ۝

کیا وہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح پیدا کیا گیا ہے اور آسمان کو کہ کس طرح بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کو کہ کس طرح کھڑے کئے گئے ہیں اور زمین کو کہ کس طرح بچھائی گئی ہے۔

پارہ (۳۰) سورۂ غاشیہ ع (۱)

یہ ہیں قرآنِ حکیم کی دی ہوئی دعوتِ فکر و نظر کے وہ چند جستہ جستہ اقتباسات جن کی روشنی میں ہمہ جہتی ترقیوں کو قابلِ اعتماد اور مستقبل کو پُر امن بنایا جاسکتا ہے فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ؟ وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْقُ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

حضرت امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کی قابلِ عمل حکیمانہ نصائح

(۱) سب سے بڑی عبادت "ایمان" اور سب سے بڑا گناہ "کفر" ہے جو شخص افضل ترین عبادت کا پابند اور بدترین معاصی سے محترز رہے اُس کی مغفرت کی بہر حال اُمید کی جاسکتی ہے!

(۲) جس شخص کو علم نے معاصی اور فواحش سے باز نہ رکھا اُس سے زیادہ کوئی زیان کار نہیں۔

(۳) جو شخص علم کو دُنیا کے لیے سیکھتا ہے علم اُس کے دل میں جگہ نہیں پکڑتا۔

(۴) اگر علماء خُدا کے دوست نہیں تو جہاں میں کوئی خدا کا دوست نہیں۔

(۵) خدا کے ساتھ دل سے وہی معاملہ کرو جو لوگوں کے سامنے ظاہر کرتے ہو۔

(۶) جس وقت مسجد سے اذان کی آواز سُنو فوراً نماز کے لئے تیار ہو جاؤ!

(۷) ہر مہینے میں تین دن روزہ رکھنے کے لیے مقرر کرلو۔

(۸) نماز کے بعد ہر روز کسی قدر وظیفہ پڑھ لیا کرو۔

(۹) قرآن مجید کی تلاوت کو قضا نہ کرو

(۱۰) لہو و لعب سے بچتے رہو۔ (۱۱) دُنیا پر بہت مائل نہ ہو۔

(۱۲) ہمسایہ کی کوئی برائی دیکھو تو پردہ پوشی کرو۔

(۱۳) اکثر قبرستان میں نکل جایا کرو۔ (۱۴) اہلِ بدعت سے بچتے رہو۔

قسم کس لئے کھائی جاتی ہے؟

مولانا حافظ سید خورشید علی صاحب
کامل التفسیر جامعہ نظامیہ

قسم ایک پُر عظمت کلمہ ہے جس کو متکلم اپنی بات کی صحت وحقانیت ثابت کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے، اور وہ اس طرح کہ اللہ کا واسطہ دے کر اپنی بات کو مؤثق و مؤکد بناتا ہے، گویا اللہ کو جو عالم الغیب ہے اپنی بات کی صداقت پر گواہ ٹھیراتا ہے، اسی لئے اہلِ اسلام کو غیر اللہ کی قسم کھانے سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ جب غیر اللہ کی قسم کھائی جائے تو وہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو یہ کہ قسم کھانے والا مقسم بہ کو عالم الغیب سمجھتا ہے یا نہیں سمجھتا، اگر سمجھتا ہے تو غیر اللہ کو اللہ کا ہمسر و شریک بنانا لازم آئے گا جو شرک ہے، اور شرک حرام قطعی ہے، اگر نہیں سمجھتا تو پھر قسم کھانا ہی درست نہ ہوگا، کیونکہ ناواقف کو گواہ نہیں بنایا جا سکتا۔

علمِ فقہ میں قسم کی تین قسمیں کی گئی ہیں:- قسمِ غموس، قسمِ منعقد، قسمِ لغو، اور اس تقسیم کی بُنیاد قرآنِ مجید کی یہ آیت ہے:-

لا یؤاخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم ولکن یؤاخذکم بما کسبت قلوبکم ط — اللہ لغو قسموں پر تم کو نہیں پکڑتا، بلکہ ایسی قسموں پر مواخذہ فرماتا ہے جو دل کے ارادے کے ساتھ کھائی جائیں۔

اب ہم ان تین قسموں کی مختصر تعریف لکھتے ہیں تاکہ تقریب مقصود میں مدد ملے:-

قسمِ غموس: کسی گزری ہوئی بات پر جان بوجھ کر واقعہ کے خلاف جھوٹی قسم کھانا، ایسی قسم کھانے والا شرعاً گنہگار ہوتا ہے۔

قسمِ منعقد: کسی آنے والی بات پر اس کے کرنے یا نہ کرنے کے متعلق قسم کھانا، شرعاً صرف یہی قسم معتبر ہے اور اسی پر احکام مرتب ہوتے ہیں۔

قسمِ لغو: کسی امر ماضی پر اس کو واقعہ کے موافق سمجھتے ہوئے قسم کھانا، درآنحالیکہ وہ اس کے مخالف تھا ——— و نیز بات بات پر واللہ یا باللہ کہنا جیسا کہ عام بولی اور تکیہ کلام کے طور پر یہ لفظ چل نکلا ہے قسمِ لغو میں داخل ہے، شرعاً ایسی قسم پر مواخذہ نہیں۔

جب ہم فقہ میں کی گئی ان تعریفات پر غور کرتے ہیں تو یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کو جھوٹی قسم کھانے سے باز رکھنا اور قسم کھانے میں احتیاط برتنے کی جانب توجہ دلانا ہے، قرآنِ مجید کی قسموں کا ان تعریفات سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ ان کا کہنے والا اللہ جل شانہٗ ہے پھر لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی کھائی ہوئی قرآنی قسموں کو کیا نام دینا چاہیئے؟ اس سوال کا جواب ہم آئندہ سطروں میں دیں گے۔

رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں اتنی قسمیں کیوں کھائیں؟

سورۂ والصّٰفّٰت سے شروع کرکے آخر قرآن مجید تک جابجا اللہ تعالیٰ نے مختلف کائناتی اشیاء کی قسمیں کھائی ہیں۔

اوّل یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ قرآنِ مجید جو کلامِ الٰہی ہے، انسانوں کی زبان اور محاورہ میں نازل ہوا ہے، اور اس کا طرزِ کلام بعینہٖ ایسا ہے جیسا کہ ایک نہایت فصیح و بلیغ شخص عربی زبان میں بات کرتا ہو اور اس کی فصاحت و بلاغت بے مثل ہو، جس طرح انسانوں کی زبانوں میں مجاز، حقیقت، تمثیل، استعارہ و کنایہ پایا جاتا ہے اسی طرح کلام اللہ میں بھی موجود ہے، یہاں تک کہ عربی زبان میں، دوسری زبانوں کے جو الفاظ شامل ہو گئے تھے وہ بھی قرآنِ مجید میں موجود ہیں۔

مثال کے طور پر لفظ فیل (بمعنی ہاتھی) جو سورۃ الفیل میں ہے، عربی زبان کا لفظ نہیں ہے، بلکہ "پیل" کا معرب ہے جو فارسی لفظ ہے۔

اسی طرح اباریق (بمعنی پیالے) کا لفظ بھی جو سورۃ الواقعہ میں آیا ہے، عربی کا لفظ نہیں ہے، اس کا واحد ابریق ہے جو فارسی لفظ "آبریز" کا معرب ہے۔

استبرق (بمعنی دبیز ریشم) اور سرادق (بمعنی پردہ یا چلمن) کے الفاظ جو سورۃ الکہف اور دیگر سورتوں میں آئے ہیں عربی زبان کے نہیں ہیں، بلکہ "استبردہ" اور "سراپردہ" سے ماخوذ ہیں جو فارسی الفاظ ہیں۔

اسی طرح کنز کا لفظ جو فارسی زبان کے لفظ "گنج" سے معرب ہوا ہے، نہ صرف اس کی جمع "کنوز" (بمعنی خزانے) قرآنِ مجید میں آئی ہے بلکہ بطورِ فعل اس کے صیغے بھی آئے ہیں، جیسا کہ اس آیت میں:۔ والذین یکنزون الذھب والفضۃ ۔ الآیۃ ۔

فردوس (جنت کا نام) کا لفظ بھی قرآنِ مجید میں کئی سورتوں میں آیا ہے، یہ عربی زبان کا لفظ نہیں بلکہ آریائی زبان سے لیا گیا ہے، جس کے معنی انگور کا باغ ہے۔ اور جو سنسکرت میں آکر "پردیش" بن گیا، جس کے معنی "اجنبی ملک" کے ہیں، اور اسی لفظ کی شکل انگریزی زبان میں "پیرڈائز" بن گئی ہے۔

اسی طرح بہت سے الفاظ قرآنِ مجید میں ایسے ہیں جو عربی زبان کے لفظ نہیں ہیں بلکہ عبرانی، سریانی، قبطی، فارسی، لاطینی، یونانی زبانوں سے معرب ہو کر عربی میں شامل ہو گئے ہیں، امام جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب "الاتقان فی علوم القرآن" میں ایک مستقل باب ان الفاظ کے لئے باندھا ہے جو غیر زبانوں سے معرب ہو کر عربی میں شامل ہو گئے ہیں اور قرآنِ مجید میں موجود ہیں، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ ایک زبان میں دوسری زبان کے الفاظ کا استعمال ہونا ماحول اور مختلف بولیاں بولنے والوں کے باہمی اختلاط کا نتیجہ ہوتا ہے عرب تجارت کے لئے مختلف ممالک میں جاتے تھے سامان کے ساتھ کچھ الفاظ کا سرمایہ بھی لاتے تھے جو ان کی زبان میں نہ تھے، اس لحاظ سے ایک زبان کا اپنی پڑوسی زبان سے متاثر ہونا فطری ہے، اور یہ تاثر عیب نہیں بلکہ زبان کے حلقہ کو وسیع کرتا اور اس کی حیاتِ نو کا سبب بنتا ہے، ایک زندہ زبان کی علامت یہ ہے کہ وہ اپنے اندر دیگر

۱؎ مزید تفصیل کے لئے دیکھو کتاب تاریخ بیہق مصنفہ ابو الحسن البیہقی، مصحح ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی مطبوعہ دائرۃ المعارف، صفحہ (۳۲۸)

زبانوں کے الفاظ کو جذب کر سکے ـــــ چنانچہ آج دنیا میں جو زبانیں بڑی مانی جاتی ہیں وہ اپنے گرد و پیش کی زبانوں سے ضرور متاثر ہیں، خود انگریزی میں کئی الفاظ ایسے ہیں جو عربی سے لے گئے ہیں، مثال کے طور پر انگریزی میں کاٹن (cotton) کا لفظ، عربی لفظ قطن (بمعنی روئی) سے ماخوذ ہے، اور اسی طرح "ڈیموکریٹک" (بمعنی جمہوریت) کا لفظ "دیمقراطیس"[1] سے لیا گیا ہے جو یونانی لفظ ہے۔

غرض کہ کلامِ مجید ایسی زبان میں نازل ہوا ہے جو اس زمانے کے اہلِ عرب کی زبان تھی۔

کلامِ مجید کا طرز بھی اسی زمانے کے طرزِ کلام پر ہے، اس زمانے میں کاہنوں اور خطیبوں کی جو عرب میں موقر اور مقدس گنے جاتے تھے یہ عادت تھی کہ عموماً فصیح کلام کرتے تھے اور اکثر مقفی و مسجع کلام بولتے تھے، چنانچہ قس بن ساعدہ الایادی جس کو "حکیم العرب" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، عرب کا ایک مشہور خطیب تھا، اس نے سوق عکاظ میں جو مشہور خطبہ دیا تھا اس کے بعض فقرے یہ ہیں:-

أيها الناس ! اسمعوا وعوا، وإذا وعيتم فانتفعوا، إنه من عاش مات، ومن مات فات، وكل ما هو آت آت، مطر ونبات، وأرزاق وأقوات، وآباء وأمهات، وأحياء وأموات، وجمع وشتات، إن في السماء لخبرا، وإن في الأرض لعبرا، ليل داج، وسماء ذات أبراج، وبحار ذات أمواج، مالي أرى الناس يذهبون فلا يرجعون، أرضوا بالمقام فأقاموا، أم تركوا هناك فناموا، أين من بنى وشيد، وزخرف ونجد، وعدّ المال والولد، أين من بغى وطغى۔

اے لوگو! سنو اور یاد رکھو، اور جب یاد رکھو تو فائدہ اٹھاؤ، (حق بات یہ ہے کہ) جو بھی زندہ ہے وہ (ایک دن ضرور) مرے گا، اور جو مرے گا وہ فنا ہو جائے گا، اور ہر آنے والی چیز آکر رہے گی، بارش اور کھیتیاں، روزیاں اور پونجیاں، باپ دادا اور مائیں، زندے اور مُردے، اکٹھے اور پراگندہ، بے شک آسمان میں خبریں (محفوظ) ہیں، اور زمین میں عبرت (کے سامان) ہیں، اندھیری راتیں، اور برجوں والا آسمان، موجیں مارنے والے سمندر، مجھے تعجب ہے کہ میں اُن لوگوں کو دیکھ نہیں پاتا جو لوگ جاتے ہیں پھر واپس آتے نہیں، کیا انھیں مقام پسند آگیا ہے کہ وہیں مقیم ہو گئے، یا (لے جائے جا کر) وہاں وہ چھوڑ دیے گئے کہ وہیں سو گئے، کہاں ہیں وہ لوگ جو عمارتیں بناتے اور ان کو گچ چونے سے مضبوط کرتے اور زر و سیم سے آراستہ و بلند کرتے تھے اور سونا چاندی جمع کرتے تھے، اور مال و اولاد کو گنتے تھے، کہاں ہیں وہ لوگ جنھوں نے بغاوت پھیلائی اور سرکشی کی۔

---

[1] یونان کا مشہور فلسفی، اجزائے عالم کے متعلق اس کے مخصوص نظریے کی مناسبت سے جمہوریت کے معنی کے لئے زبان انگریزی میں یہ لفظ نقل کیا گیا، تفصیل کے لئے فلسفۂ قدیم کی کتاب "ہدایۃ الحکمت" دیکھئے۔

چنانچہ قرآنِ مجید بھی از ابتدا تا انتہا اسی طرزِ کلام پر مقفی و مسجع نازل کیا گیا ہے کیوں کہ یہ اس زمانے کے فصحاء کا طرز تھا اور یہ طرز اہلِ عرب میں مقبول تھا۔

اسی طرح قسموں کا استعمال بھی عربوں میں عام تھا، جس بات کو وہ سچ سمجھتے تھے اور دوسروں کو اس کے سچ ہونے کا یقین دلانا چاہتے تھے اس کو قسموں کے ساتھ بیان کرتے تھے۔

زمانہ جاہلیت کا کلام ہم تک بہت کم پہنچا ہے، مگر ابن اثیر نے اپنی کتاب کامل میں قبیلۂ بنی خزاعہ کے ایک کاہن کا قول ہاشم کی فضیلت اور امیہ کی منقصت میں نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کس قدر قسمیں کھائیں، اور وہ قول یہ ہے:-

والقمر الباهر، والكواكب الزاهر، والغمام الماطر، وما بالجو من طائر، وما اهتدى بعلم مسافر، من منجد وغائر، لقد سبق هاشم أمية في المآثر، اول منه وآخر، وأبو هممة بذلك خابر،

قسم ہے روشن چاند کی، قسم ہے روشن ستاروں کی، قسم ہے برستے بادلوں کی، قسم ہے آسمان میں اڑنے والے پرندوں کی، قسم ہے دور دراز راستوں پر چلنے والے مسافروں کے نشانوں سے ہدایت پانے کی، کہ ہاشم امیہ پر مقابلہ میں سبقت لے گیا، پہلا بھی انہی سے ہے اور پچھلا بھی انہی سے، اور ابو ہمہمہ کو اس بات کی خبر ہے۔

چنانچہ اسی طرزِ کلام پر جو عربوں کو عام طور پر مرغوب اور دل پسند تھا اور جو نہایت فصیح طرزِ کلام سمجھا جاتا تھا، قرآن مجید نازل ہوا ہے، اور اس میں بھی جن باتوں کا یقین دلانا منظور ہے ان کو قسموں کے ساتھ بیان کیا ہے، جیسا کہ مندرجۂ ذیل آیات میں:-

والشمس وضحٰها ۝ والقمر اذا تلٰها ۝ والنهار اذا جلّٰها ۝ والّيل اذا يغشٰها ۝ والسماء وما بنٰها ۝ والارض وما طحٰها ۝ ونفس وّما سوّٰها ۝ فألهمها فجورها وتقوٰها ۝ قد افلح من زكّٰها ۝ وقد خاب من دسّٰها ۝

قسم ہے سورج کی اور اس کی دھوپ کی، قسم ہے چاند کی جب وہ سورج کے پیچھے نکلتا ہے، قسم ہے دن کی جبکہ سورج اس کو روشن کرتا ہے، قسم ہے رات کی جبکہ وہ سورج کو چھپا لیتی ہے، قسم ہے آسمان کی اور اس کو بنانے والے کی، قسم ہے زمین اور اس کو بچھانے والے کی، قسم ہے نفس کی اور اس کو ٹھیک سے سنوارنے والے کی، پس اس نے (یعنی خدا نے) نفس کو فرمانبرداری اور نافرمانی کی راہ بتا دی ہے، بے شک وہ (انسان) فلاح پا گیا جو (اپنے) نفس کو پاک کیا (رذائل سے)، اور بلا شبہ نقصان میں رہا جو اپنے نفس کو گندگی میں دبائے رکھا۔

اور اسی طرزِ کلام اور غیبی امور کی اطلاع دہی کے سبب سے عرب کے مشرکین آنحضرت کو شاعر اور کاہن خیال

کرتے تھے جس کی قرآنِ مجید میں سخت تردید کردی گئی، چنانچہ فرمایا:-

فلا اقسم بما تبصرون ٥ وبما لا تبصرون ٥ إنه لقول رسول كريم ٥ وما هو بقول شاعر قليلا ما تؤمنون ٥ ولا بقول كاهن قليلا ما تذكرون ٥ تنزيل من رب العالمين ٥

قسم ہے اس چیز کی جو تم کو دکھائی دیتی ہے اور جو دکھائی نہیں دیتی، کہ یہ (قرآن مجید) بزرگ پیغمبر (کی زبان سے نکلا ہوا خدا) کا کلام ہے یہ کسی شاعر کا کلام نہیں، مگر تم بہت کم یقین کرتے ہو، اور نہ کسی کاہن کا قول ہے مگر تم بہت کم غور کرتے ہو، (بلکہ یہ) پروردگارِ عالم کی طرف سے اُتارا ہوا ہے۔

اس تردید کو بھی اللہ تعالیٰ نے قسم ہی کے ساتھ بیان فرمایا ہے، اور قسم بھی ایسی جو ان کی سمجھ کے عین مطابق تھی۔ دوسری جگہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا:-

فذكر فما انت بنعمة ربك بكاهن ولا مجنون ٥

آپ نصیحت کئے جائیے، خدا کے فضل سے نہ تو آپ کاہن ہیں اور نہ مجنون۔

مختصر یہ کہ یہ قسمیں اسی طرزِ کلام پر واقع ہوئی ہیں جو عرب کا طرزِ کلام تھا، ہاں البتہ اس طرح قسمیں کھانے پر اس بات کا شبہ ہوتا ہے کہ ہرگاہ اللہ کے نام کے سوا کسی اور کی قسم کھانی منع کی گئی ہے، تو خود اللہ تعالیٰ نے غیر اللہ کی قسمیں کیوں کھائیں؟! اس شبہ کا ازالہ یہ ہے کہ غیر اللہ کی قسمیں کھانے کا امتناع جیسا کہ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں، اس سبب سے ہے کہ اس میں شانِ الوہیت کا شائبہ پایا جاتا ہے، اور قسم کھانے والے پر شرک میں آلودہ ہونے کا خدشہ لگا رہتا ہے، — مگر جب یہ مسلّم ہے کہ تمام چیزیں مخلوق ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سب کا خالق ہے، تو اگر خالق اپنی مخلوق کی قسم کھائے تو کسی طرح شائبۂ الوہیت اس مخلوق میں نہیں سمجھا جا سکتا، اگر کچھ سمجھا جاتا ہے تو اسی قدر سمجھا جاتا ہے کہ وہ چیزیں اپنی خلقت میں یا انسانوں کے لئے مفید ہونے میں عظیم الشان وعظیم القدر ہیں، — لیکن اگر انسان جو مخلوق ہے ان میں سے کسی کی قسم کھائے، خصوصاً ایسی چیزوں کی جن کو مشرکین پوجتے تھے تو ان میں شانِ الوہیت کے ماننے کا شبہ جاتا ہے، پس اسی لئے مسلمانوں کو جو اللہ واحد کے ماننے والے ہیں غیر اللہ کی قسم کھانے سے روکا گیا۔ اور یہ کہ اللہ کے عظیم الشان نام کو خلافِ واقعہ امور کے اثبات میں استعمال نہ کریں اور بلا سوچے سمجھے کسی واقعہ کی خبر دینے میں قسم کا استعمال کریں۔

اسلام کا نظامِ معاشیات

مولانا عبد الرحمن صاحب
نائب شیخ الادب جامعہ نظامیہ

ذرا غور سے کام لیا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دنیا کی کوئی شئی بھی کسی کی حقیقی ملکیت نہیں۔ عقلی طور پر تو اس لیے نہیں کہ دنیا کی حقیر ترین اشیاء میں سے کوئی ایک شئی لے لیجئے اور اس میں غور فرمایئے کہ یہ آئی کہاں سے اور کیوں کر ہمارے استعمال میں ہے؟

مثال کے طور پر ایک فقیر بے نوا کی وہ بوسیدہ گدڑی کو ملاحظہ کیجئے جو اس کی سرمایۂ حیات ہے یقیناً وہ فقیر کی ملک ہے لیکن وہ فقیر کی ملکیت سے قبل کتنوں کی ملکیت میں غلام بنی ہوگی؟ اولاً وہ ایک بے صورت مادہ روئی کی شکل میں کسی کی ملکیت میں آئی پھر اس کے بعد دوسرے کی ملکیت میں بصورت دھاگہ رہی، پھر تیسرے کی ملکیت میں بصورت کپڑا رہی، پھر اس کے بعد حقیر ترین وجود یعنی گدڑی کی شکل میں فقیر کی مایۂ حیات بنی۔ یہی نہیں اس کے علاوہ اور بھی اس کے کئی وجود رہے ہیں جس کا آخری سلسلہ خالق کائنات کی ذاتِ قدیم تک منتہی ہوتا ہے۔ تو ایسی صورت میں بھلا اُس فقیر کا ادعا کیسے قابلِ قبول ہوگا کہ یہ گدڑی میری حقیقی ملکیت ہے۔ ملکیت حقیقی کا تقاضہ تو یہ ہے کہ شئی مملوک پر کسی بھی صورت میں دوسرے کی ملکیت طاری نہ ہو اور جس مملوک کی بعینہٖ ایسی شان ہو وہ حقیقی طور پر اس کا مالک و خالق ہے۔

شرعی طور پر بھی کسی کے لیے ملکیت حقیقی ثابت نہیں ہوتی تمام کتب سماویہ اس بات پر متفق ہیں کہ کائنات کا ذرہ ذرہ کسی خالق کا رہونِ منت ہے قرآن حکیم کہتا ہے "اللہ خالق کل شئی" اللہ ہر شئی کا خالق ہے۔ "لہٗ ملک السمٰوات والارض" زمین و آسمانوں کی ملکیت اُسی کو حاصل ہے۔ "خلق السمٰوات والارض" زمین و آسمانوں کو اُس نے پیدا کیا۔ "بدیع السمٰوٰت والارض" زمین اور آسمانوں کو وجود میں لایا "مالک الملک تؤتی الملک من تشآء وتنزع الملک ممن تشآء وتعز من تشآء وتذل من تشآء بیدک الخیر انک علیٰ کل شئیٍ قدیر" وہی مالک الملک ہے وہ جس کو چاہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہے چھین لیتا ہے جس کو چاہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہے ذلیل و خوار کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ غرض کہ اس قسم کی صدہا آیات اللہ جل شانہٗ کے لیے حقیقی ملکیت ثابت کرتی ہیں۔

بہر حال جب یہ بات ثابت ہے تو یہ بھی قابلِ تسلیم ہوگا کہ مخلوق کی کوئی شئی حقیقتاً ملکیت نہیں جو کچھ بھی جس کے پاس ہے وہ عطیہ ہے، ہبہ ہے، بخشش ہے۔ اس سے زیادہ اس کی اور کچھ حقیقت نہیں وہ دھوکے میں ہے جو خدا کی دی ہوئی اشیاء پر غرہ کرتے اور خدا کو بھول جاتے ہیں۔ کیسے کیسے آن بان اور رعب و داب رکھنے والے کیسے ہو گئے اور کیا سے کیا بن گئے؟ تاریخ کے اوراق میں بھی ڈھونڈنا چاہو تو پتہ نہیں چلتا۔

ایک عارف کہتا ہے:-

متاعِ دہر پہ غرہ نہ کر ہے سخت نادانی — غذائے مور ہیں دیکھا جو کرتے تھے سلیمانی
عجب ناداں ہیں جن کو ہے تخت و تاج پر غرہ — کسی کی قیصری باقی رہی اس جا نہ خاقانی

الغرض ملکیت کے تعلق سے اسلام کا نظریہ نہایت واضح اور معقول تر واقع ہوا ہے۔ اسلام نہ تو موجودہ زمانے کی سرمایہ داری کا قائل ہے اور نہ اشتراکیت کا پجاری۔ اسلام ان دونوں نظریوں کے درمیان اپنا ایک ایسا معتدل و مقتصد نظام معاشیات پیش کرتا ہے جو کسی زمانے میں بھی ناممکن العمل اور کسی وقت بھی باعث زحمت و کلفت نہیں۔ اس کا ایک ایسا نظام ہے جس کے نافذ ہوتے ہی پورے عالم انسانیت میں امن و سکون کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے نہ تنگدست اپنی تنگ دامنی کا گلا کر سکتا ہے نہ تونگر اپنی غنا میں سرمست و بے خود ہو سکتا ہے۔ نہ یہ ممکن ہے کہ دولت کے خزانوں پر چند افراد یا جماعتیں بے دست و پا سانپ بن کر بیٹھ جائیں اور دوسرے افرادِ ملت کی وہاں تک رسائی ناممکن ہو جائے اور نہ یہ ممکن ہے کہ صلاحیت و قابلیت کے مختلف فطری درجات یک قلم حذف ہو کر سب انسان برابر ہو جائیں اور کسی کو کسی پر فطری برتری بھی باقی نہ رہے۔ حتیٰ کہ افرادِ انسانی مالکانہ حقوق سے بھی محروم ہو جائیں۔

قرآنِ حکیم میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مالکِ حقیقی جل شانہٗ نے عالم کی تمام اشیاء کو نفع انسانی کے لیے پیدا کیا ہے۔ "وھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا" الآیۃ۔ اس ذات نے زمین و آسمانوں کی تمام اشیاء کو انسان کے لیے پیدا کیا۔ "ھو الذی جعل لکم النجوم لتھتدوا بھا" اس ذات نے ستاروں کو انسان کی رہبری کے لیے پیدا کیا۔ "ھو الذی جعل لکم اللیل والنھار" اس ذات نے انسانوں کے لیے رات و دن پیدا کئے۔ "ھو الذی جعل الشمس ضیاء والقمر نورا" اس ذات نے سورج و چاند کو روشنی کے لیے پیدا کیا۔ "وانزل لکم من السمآء ماءً" اسی نے آسمان سے انسانوں کے لیے پانی نازل کیا۔ "ینبت لکم بہ الزرع والزیتون والنخیل والاعناب ومن کل الثمرات" اس نے انسانوں کے لیے کھیتیاں، زیتون، کھجور، انگور اور ہر قسم کے پھل اگائے۔

غرض یہ کہ "وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا" اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنے لگو تو احاطہ نہیں کر سکتے۔ پھر اس نفع سے متمتع ہونے کے لیے عالم کی ان تمام اشیاء کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا یہ ایک ایسی معجز نما تقسیم ہے جس سے بہتر اور نفع بخش تقسیم ممکن نہیں۔

قسمِ اوّل: عالم کی ان اشیاء سے بعض اشیاء ایسی ہیں جن کو پورے عالم انسانیت و حیوانیت کے لیے وقفِ عام کر دیا گیا اس میں کسی کے لیے کوئی تخصیص بھی نہ رکھی گئی مکھی اور مچھر سے لے کر ہاتھی اور شتر مرغ سب کو شریک کر دیا گیا کسی قسم کا حقِ تملیک بھی روا نہیں رکھا گیا بلکہ معاشرہ انسانی کے مشترک اور اجتماعی انتفاع کے لیے بنا دیا گیا۔ "الخلق عیال اللہ" یعنی پوری مخلوق جو عیال اللہ ہیں ایک ساتھ بلا امتیاز بہتری و برتری نفع یاب ہو سکیں اس میں کسی کو کسی پہ بالادستی حاصل نہ رہے اور کوئی بھی کسی کا محتاج و دست نگر نہ بنے۔ ان اشیاء میں

انفرادی ملکیت کو نہ صرف قانوناً ممنوع قرار دے دیا گیا بلکہ عملی طور پر ایسا ناممکن بنا دیا گیا کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی دعوئ ملکیت سے عاجز و درماندہ ہے۔ جیسے آسمان اور فضاء، آسمان کی کل مخلوقات خواہ وہ سیارے ہوں یا باد و برق و باراں سب اس میں داخل ہیں اور دُنیا کا سب سے بڑا حصہ اسی کا ہے ان سب چیزوں کو پورے عالَم کے لیے مشترک اور وقفِ عام اس طرح کر دیا گیا کہ بڑی سے بڑی طاقت کی یہ مجال نہیں کہ آفتاب و مہتاب کی روشنی یا حرارت یا فضائی ہواؤں پر مالکانہ حقوق ثابت کرے یا ان کے کسی ایک حصے پر تسلط و غلبہ حاصل کرنے اور دولت کی طرح اس کو اپنے خاندان میں منتقل کر دے۔ ہواؤں کے یہ سمندر کبھی بھی کسی کی بالادستی کو قبول نہ کر سکے بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ بڑی بڑی سلطنتوں کو ہواؤں نے زیر و زبر کر دیا۔ "واما عاد فا ھلکوا بریح صرصر عاتیۃ سخرھا علیھم سبع لیال و ثمانیۃ ایام۔" قوم عاد کی بستیوں کو اسی ہوا نے سات رات آٹھ دن تک اپنے آغوش میں لیے اُڑتے رہی۔ تاریخ عالم اس کی شاہد عدل ہے خدائیت کا دعویٰ کرنے والے متکبرین بھی اس کی جرأت نہ کر سکے۔ اللہ کے رسولوں نے ایسے خودسروں کی عجز و بیتی کو اسی طرح خود ان کی زبانی ظاہر کیا۔ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے نمرود مردود کو اسی طرح خطاب فرمایا تھا "فان اللہ یأتی بالشمس من المشرق فات بھا من المغرب"۔ میرا رب تو وہ ہے جو آفتاب کو مشرق سے طلوع کرتا ہے اگر تجھ کو قدرت ہو تو مغرب سے طلوع کر؟ "فبھت الذی کفر"۔ کافر حیران رہ گیا۔

غرض یہ کہ عالم کا یہ طبقہ کچھ اس طرح سے پیدا کیا گیا کہ پوری مخلوق اس سے منتفع ہو کسی کو مجال تملیک نہیں۔

قسمِ دوم: ایسی اشیاء کی ہے جس پر انسانی تصرف و قبضہ ممکن ہے انسان چاہے تو اس پر اپنا حقِ ملک ثابت کر سکتا ہے اور اُس پر اپنی بالادستی ثابت کر سکتا ہے لیکن اللہ جل شانہ کی حکمت بالغہ نے ایسی اشیاء کو مشترک انتفاع کے لیے وقف عام قرار دے کر انفرادی ملکیت سے خارج کر دیا۔ گویا یہ اشیاء بھی قسم اول کی طرح تمام عالم کے لیے جائز الانتفاع قرار دی گئیں۔ نفع یابی تو سب کے لیے ہے البتہ اس میں تملیک اور مالکانہ حقوق کسی کو نہیں دیئے مخلوقِ خدا بلا امتیاز فرقِ مراتب یکساں طور پر نفع یاب ہوں جیسے پورا سمندر اور اس کی غیر محدود مخلوق۔ خودرو چشمے نالے ندیاں۔ غیر آباد پہاڑی جنگل اور اُس کے خودرو درخت و گھاس۔ زمین سے نکلنے والا پانی، زمین کی معدنیات، بڑے بڑے پہاڑ وغیرہ ان سب چیزوں کو اسلامی قانون نے وقفِ عام اور مشترک انتفاع کے لیے قرار دیا ہے کسی ایک فرد کو یا چند افراد انسانی کو ان پر مالکانہ حقوق نہیں دیئے اگر کوئی ملکیت کا دعویٰ کرے تو اسلام اس کے دعوے کو قبول نہیں کرتا۔ اس لیے فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ جنگل کا خودرو گھاس اور اُس کے چرند و پرند خودرو نالے ندیاں اور اُن کی مخلوق وقفِ عام ہیں ہر شخص نفع اُٹھا سکتا ہے چند جزئیات وضاحت کے لیے لکھی جاتی ہیں۔ اول پرندے جب تک ہوا میں ہیں کسی کی ملکیت نہیں جو شکار کر لے اُس کی ملکیت ہو جاتے ہیں۔ دوم مچھلیاں جب تک پانی میں ہیں

کسی کی ملکیت نہیں اور جب کسی نے پکڑ لیا اُس کی ملکیت ہوگئیں خواہ وہ ندی نالہ کسی کی ملکیت میں کیوں نہ ہو۔ سوم غیر آباد جنگل کا اندوختہ خودرو گھاس پھل پھول اُسی کی ہوں گی جو اس کو توڑے حتیٰ کہ صراحت کردی گئی کہ کسی مملوک زمین میں خودرو گھاس کو کوئی شخص کاٹ رہا ہو تو صاحب زمین کو اجازت نہیں کہ منع کرے۔ چہارم۔ ندی نالوں کا پانی ہر شخص حسب ضرورت لے سکتا ہے۔ پنجم۔ جنگل کے جانور کسی کی ملکیت نہیں جو پکڑلے وہی اُس کا مالک۔ اس قسم کے کئی مسائل ہیں جو کتب فقہ میں درج کئے گئے ہیں دراصل یہ اسی قانون کا نتیجہ ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے وقفِ عام کی شکل میں انسانوں کے لیے پیدا کیا ہے نیز ذرا غور کیا جائے تو ان اشیاء کا وقفِ عام ہونا عالم کے لیے نہایت ضروری تھا ورنہ اگر ان پر بھی مالکانہ حقوق رکھ دیئے جاتے تو ممکن تھا لیکن انسانی زندگی نہایت تنگ اور پریشان کن ہوجاتی اور کم از کم غرباء کا طبقہ تو موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہوجاتا اور نہ معلوم کن کن مشکلات کا پیش خیمہ بنتا یہ حکیم و خبیر کی تقسیم ہے جس نے انسانوں کے لیے وسائلِ حیات وسیع تر کردیئے۔

قسمِ ثالث: مذکورہ بالا دو قسموں کے علاوہ ان اشیاء کی ہے جن پر اسلام نے انفرادی ملکیت کو ضروری قرار دیا ہے اور اس کے بغیر نظامِ معاشرت کی تکمیل تو کجا نظامِ عالم کا بقا بھی ممکن نہیں گویا یہ ایسی اشیاء ہیں جن پر انفرادی ملکیت ناگزیر ہے۔ ان اشیاء پر اللہ جل شانہٗ نے اپنے حکیمانہ قانون سے انسانوں کو انفرادی ملکیت عطا فرمائی ہیں جیسے رہنے کا مکان، کھیتی کی زمین، پھل والے درخت، اور ایسے تالاب کنوئیں جس کو انسان نے اپنی سعی سے تیار کیا ہو اسی تیسری قسم میں داخل ہیں۔ اس میں انفرادی ملکیت بقاءِ زندگی کے لیے ضروری ہے اگر اس میں بھی وقفِ عام کی شکل دے دی جاتی تو یہ دنیا ہمہ وقت میدانِ کارزار نظر آتی۔ زبردست زیردست پر ہمیشہ حکمراں ہوتا، قوی ضعیف پر غالب رہتا، بڑا چھوٹے پر۔ غرض کہ دنیا میں عدل و انصاف معدوم ہوجاتا کیونکہ فطرت ہر شخص کی جلبِ منفعت اور نفع یابی کی ہے۔

پھر یہ انفرادی ملکیت جو ضروری قرار دی گئی وہ بھی غیر محدود زمانے تک نہیں بلکہ مالک کی حیات تک ہے اس کے بعد اس کا منتقل ہونا ضروری قرار دیا گیا۔ احکام میراث اسی لیے جاری کئے گئے کہ انفرادی ملکیت ابدالآباد تک کسی کے لیے روا نہیں بلکہ اس کی ذاتی ملکیت میں ایسا قانون و نظام رائج فرمایا کہ یہ ملکیت خاص بھی منتقل ہوتی رہے اور دیگر افرادِ انسانی بھی اس سے نفع یاب ہوتے رہیں قانون میراث کی یہی حکمت ہے۔ ــــــ ورنہ انفرادی ملکیت کا حقیقی مصرف تو یہی ہوسکتا تھا کہ مرنے والے کے ساتھ اُس کا مال بھی دفن کردیا جائے اور کسی کو اس سے کچھ حصہ نہ ملے اگرچہ ایسی صورت عقلاً بھی غیر معقول ہے لیکن اسلام کا ہر قانون بھی تو عقلِ سلیم کے مطابق ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ قانونِ زکوٰۃ اور صدقات اور قانونِ حقوق بھی اسی مقصد کے لیے ضروری قرار دیئے ہیں کہ یہ انفرادی ملکیت بھی کسی ایک کی مایۂ حیات نہ بنی رہے خدا کی یہ پیدا کردہ اشیاء بندگانِ خدا کے کام آئے

قانونِ زکوٰۃ کا عدیم المثال طریقہ اسلام نے اسی غرض کے تحت ضروری قرار دیا، حکومت کو اختیار دیا کہ جبراً و قہراً مقررہ زکوٰۃ حاصل کرے اور مستحقین تک پہنچا دے پھر ان میں حصۂ مفروض کے علاوہ ترغیب مزید سے صدقاتِ نافلہ کو رائج کیا اور بعض صورتوں میں ایسی ترغیب دی کہ انسان کے لیے جان و مال کو تمام کا تمام راہِ خدا میں دے دینا آسان نظر آتا ہے۔

اسی تعلیم و ترغیب کی ایک نظیر تاریخ میں یہ ملتی ہے کہ انصار نے بے سر و سامان مہاجرین کے سامنے اپنے پورے املاک کا نصف نصف حصہ پیش کر دیا تاریخ کے پڑھنے والے یہ دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں کہ انھوں نے اپنی دو بیویوں میں سے ایک کو اپنے مہاجر بھائی کے لیے حلال کر کے پیش کر دیا۔

صدقات و زکوٰۃ و حقوق اقربا کے علاوہ انتقالِ ملکیت کے جو طریقے بذریعہ معاملات خرید و فروخت ہبہ، وصایا وغیرہ ہیں ان پر بھی کچھ اس قسم کی پابندیاں عاید کر دیں کہ ان اشیاء کے ذخائر پر مخصوص افراد یا جماعتوں کا تسلط نہ ہو جائے اور دیگر افرادِ انسانی محتاج ہو کر رہ جائیں۔

اسلام میں سود کی شدید ممانعت کا بڑا راز یہی ہے کہ تجارتی ربوا کے ذریعے ملتِ اسلامیہ کا پورا سرمایہ سمیٹ کر چند افراد کے قبضے میں نہ آجائے دولت جو خدا کی بڑی نعمت ہے اس لیے نہیں کہ شریفوں کی شرافت ملیامیٹ ہو جائے عزت ریزی ہو جائے، غیرت داروں کے بے گناہ ہاتھوں میں ہتکڑیاں ڈالی جائیں، غیور انسانوں کو خودکشی کے سنگین جرم کا مرتکب ہونا پڑے۔ اور آخر کار انصاف، تمدن و اخلاق اور اجتماعیت کا جنازہ نکل جائے۔ سرمایہ داری کے کرشموں میں سے یہ چند کرشمے ہیں، اس کے شرمناک نمونوں میں سے یہ چند نمونے ہیں۔

اسلامی نظامِ معاشیات میں ذخیرہ اندوزی کی ممانعت بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے ذخیرہ اندوزی ایک ایسا قومی مجرم ہے جس کا جرم کسی جابر بادشاہ اور ظالم ڈاکو و رہزن کے جرم سے شدید تر ہے۔ قرآن حکیم ایک موقعہ پر نہایت ہی لرزہ براندام انداز سے ذخیرہ اندوزی کا انجام بیان کرتا ہے۔ جو لوگ سونا چاندی کا ذخیرہ کرتے ہیں اور اس کو راہِ خدا میں صرف نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی دھمکی دے دی جائے اس دن ان کے ذخیرے کو پگھلا کر ان کی پیشانیوں اور پہلوؤں و پشتوں کو داغا جائے گا۔ (القرآن)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ایسا مال قیامت کے دن زہریلے اژدہے کی شکل میں ذخیرہ اندوز پر مسلط کر دیا جائے گا وہ اس کو ڈستا جائے گا اور یہ کہے گا: "انا کنزک انا مالک" میں تیرا خزانہ ہوں میں تیرا مال ہوں۔ (الحدیث)

مختصر یہ کہ دولت بلا شبہ اللہ کی ایک نعمت ہے اس کا بہترین مصرف اور صحیح شکر بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی اور ان کے مصائب میں عملی شرکت و غمگساری کرنا اور جس کا مقصد تجارت، زراعت، صنعت و حرفت کے کاروبار پھیلانا ہے وبس۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فروعی مسائل میں اختلافِ فقہا کے اسباب

محمد سلطان محی الدین
کامل الفقہ (نظامیہ)
بی۔اے (عثمانیہ)

بعض گوشوں سے یہ سوال بار بار اُٹھتے رہتا ہے کہ فقہاءؒ میں تقریباً ہر مسئلہ میں اختلاف کیوں پیدا ہوا اور اس کے وجوہ و اسباب کیا ہیں ؟ جبکہ دین اور اس کی تعلیم ایک ہے۔ خاص طور سے غیر مقلدین حضرات تو اس کو خوب ہوا دیتے ہیں۔ تقلیدِ فقہاء کے عدم جواز و عدم افادیت کے بارے میں دلائل و براہین کا انبار اکھٹا کرنے اور ہر قسم کے رطب و یابس سے کام لینے میں اربابِ عقل و دانش کو ذرا بھی تامل نہیں گزرتا۔ اگر یہ انصاف و حقیقت پسندی سے اپنی روزمرہ کی زندگی اور اس کے گرد و پیش کا صحت مندانہ جائزہ لیں تو ان پر بہت جلد منکشف ہوگا کہ وہ خود بھی کسی نہ کسی جہت اور شکل میں شعوری اور لاشعوری طور پر اپنے کسی مقتدا، پیر و مرشد اور استاذ کی نہ صرف تقلید کرتے ہیں بلکہ بیشتر اُمور میں اپنے آباء و اجداد کی محض نقالی کرتے ہیں اور اسی طرح عوارضات و معاملاتِ دُنیا میں ڈاکٹر، حکیم اور وکیل وغیرہ کے مشوروں اور ہدایات کی بلا چوں و چرا تعمیل کئے جاتے ہیں۔ نیز میدانِ سیاست میں، سیاست کے مسلمہ و شہرۂ آفاق لیڈر، ہیرو، رہنما و مہاتما کی تقلید کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ ان آنجہانی مہاتماؤں کی زندگی کو امر قرار دے کر ان کے ساختہ و پرداختہ اُصول و تعلیمات کی اشاعت و تبلیغ کو اپنا فرضِ منصبی بھی سمجھتے ہیں اور یہ سب کچھ اربابِ فہم و فراست سے ہی صادر ہوتا اور سر انجام پاتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے ؟ اب اس سوال کے جواب کو خود انھیں پر چھوڑ دیا جاتا ہے یا پھر اس کو کسی دوسرے موقع کے لیے فی الوقت یہاں قلم انداز کیا جاتا ہے۔

لیکن جن مؤید من اللہ اتقیاء و صلحاء کہ جنھیں دین میں اعلیٰ درجہ کا تفقہ، سمجھ بوجھ، کمال درجہ کی نظر و بصیرت اور تبحرِ علمی حاصل تھا اور جو دین کے مسلم الثبوت اطباء و حکماء تھے اور علم و فضل میں یکتائے روزگار ____ مقنین اسلام اور اس کے اساتذہ تھے آج ان مقدس شخصیتوں کی علمی کاوشوں اور عرق ریزیوں کو بے سود و بے فیض اور ان کی پیروی کو خلافِ عقل و دین تصور کیا جاتا ہے حالانکہ فقہاء کرامؒ کی تقلید ہی میں خدا اور رسولؐ کی اتباع مضمر ہے اس لیے کہ دراصل علماء و مجتہدین "اولوالامر" میں داخل ہیں چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:-

یاایھا الذین اٰمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم ۔

اے ایمان والو تم اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور اپنے ہدایت دینے والوں کی بھی۔

غرض کہ انھیں فقہاءِ اسلام کی مساعیِ جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ مُسلمان تو مُسلمان خود اقوامِ عالم نے اسلام کو جانا اور پہچانا۔ اس سے قریب ہوئے اور ہوتے ہی جا رہے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ آخر فقہاء میں اختلاف کیوں پیدا ہوا؟ فقہاء میں اختلاف اور مسائل فقہیہ میں اختلاف

دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اختلاف کے عموم مفہوم کے لحاظ سے ان میں کوئی شخصی اور ذاتی اختلاف نہ تھا۔ ان میں جو مسائلی اختلاف ہے وہ بھی اپنی ذاتی رائے، انفرادی نقطۂ نظر اور اڑ جانے کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ تو صرف علم و اجتہاد، تحقیق و تفتیش اور اقرب الی الصواب ہونے کی بنیاد پر ہے اور ویسے بھی روایات و آثار میں بظاہر جو تضاد و تعارض نظر آتا ہے وہ تخصیص و تعمیم، اطلاق و تقیید، حقیقت و مجاز، زمان و مکان، عزیمت و رخصت اور ناسخ و منسوخ کو ملحوظ نہ رکھنے کا نتیجہ ہوتا ہے۔

فقہائے کرام کی مدت العمر جد و جہد اور محنت شاقہ کا اہم مقصد شارع کے اصل منشاء کو سمجھنا اور اس کی تشریح و توضیح کرنا ہے تاکہ مکلفین کے لیے عمل میں سہولت ہو اس لیے کہ ہر مکلف میں اتنی صلاحیت اور استعداد علمی نہیں ہوتی کہ وہ قرآن و حدیث کو بالراست سمجھ سکے اور شارع کے اصل منشاء کو معلوم کرلے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے مکلفین کی افہام و تفہیم کے لیے فقہاء اور ارباب استنباط کو مختص کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
لعلمه الذين يستنبطونه منهم ۔ قرآن کو وہی لوگ جانتے ہیں جو احکام کا استنباط کرسکتے ہیں۔
غرض اللہ نے جن کو چاہا "تفقہ فی الدین" عطا کیا " ومن يرد الله به خيرا يفقهه في الدين"۔ وذلك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم ۔

فقہاء کی جد و جہد تشریح دین کا باعث بنی

چنانچہ فقہائے کرام نے اپنے اس عظیم فرض کی تکمیل میں نہایت ہی شرح و بسط کے ساتھ بڑی محنت و دیدہ ریزی سے قرآن و حدیث کی تشریح و توضیح کردی اور مکلفین کو اس کی تفہیم کرادی اور یہی "فقہ" ہے جو بالفاظ دیگر قرآن و حدیث کی تفسیر ہے۔ دین کی اس تفسیر و توضیح میں جیسا کہ ہمیں کتب فقہ میں تصریحات ملتی ہیں مختلف نقاط ہائے نظر سے یہ چند وجوہ و اسباب فقہی مسائل میں اختلاف پیدا ہوا اور "اختلاف امتی رحمۃ" کے ارشاد کے بمصداق رحمت ثابت ہوا اور انشاء اللہ العزیز فقہاء کے یہ مہتم بالشان قابل تقلید علمی خدمات ہمیشہ رحمت ہی ثابت ہوں گے اور ان کی افادیت باقی رہے گی۔

اختلاف کے وجوہ و اسباب

بعض فقہائے کرام نے نص قرآنی کے ظاہر حکم اور عموم خطاب کو ملحوظ رکھا اور بعض نے نص قرآنی میں حکم کی غرض و غایت اور منشاء کو اصل قرار دیا۔ چنانچہ آیۂ کریمہ :- انما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملين عليها والمؤلفة قلوبهم وفي الرقاب والغارمين وفي سبيل الله وابن السبيل فريضة من الله میں مصارف زکوٰۃ میں دیگر مستحقین زکوٰۃ کی طرح "مؤلفۃ قلوبہم" کا ذکر بھی ہے۔ نص کے اس ظاہر حکم کے تحت بعض فقہائے کرام نے مستقل طور پر جدید الایمان لوگوں کو بھی ان کی دلداری اور دلجوئی کے لیے مصارف زکوٰۃ میں شامل رکھا ہے تاکہ وہ اسلام پر قائم رہیں لیکن جمہور فقہاء کے نزدیک یہ مصارف زکوٰۃ میں شامل نہیں ہیں اب جبکہ اسلام مضبوط اور طاقتور ہوگیا ہے، رشد و ہدایت،

ضلالت وگمراہی سے واضح اور ممتاز ہو گئی ہے لہذا یہ حکم باقی نہیں رہا اس لیے کہ حالات کے بدلنے سے حکم کا بدلنا بدیہی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ لا انفصام لہا واللہ سمیع علیم ۔

دین میں زبردستی نہیں۔ یقیناً ہدایت گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے پس جو شخص شیطان سے بد اعتقاد ہو اور اللہ پر ایمان و یقین لایا ہو تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا جو کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

یہی مسلک حضرت عمرؓ کا بھی تھا چنانچہ آپ نے اپنے زمانہ خلافت میں اس قسم کے تمام وظائف کو ختم کر دیا اور اعلان کر دیا کہ جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے " فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر " غرضیکہ اب تالیف قلوب کے لیے مال زکوٰۃ سے صرف کرنے کا حکم باقی نہیں رہا۔

۲۔ بعض فقہاء نے شریعت غرہ کے منشا سختی کو ملحوظ رکھا اور بعض نے نرمی تخفیف و سہولت کے منشاء کو ملحوظ رکھا جس کی وجہ سے مسائل میں اختلاف رونما ہوا۔

۳۔ نص قرآن اور حدیث وقیاس کا بظاہر تعارض۔

۴۔ قرآن کریم کی دو آیات میں مفہوم کے سمجھنے اور اس کے تعین میں اختلاف۔

۵۔ احادیث و آثار میں باہمی تعارض اور اس کے مختلف اسباب۔ رفع تعارض اور تطبیق احادیث میں مختلف طریقہ کار اور صحت حدیث کے مختلف شرائط۔

۶۔ اختلاف زمان ومکان۔

۷۔ دو مختلف حدیثوں کے موقع ومحل کے تعین میں اختلاف کسی فقیہہ نے اس کو خصوصیت پر محمول کیا اور کسی نے عمومی حکم ثابت کیا جس کی وجہ سے مسائل میں اختلاف پیدا ہوا۔

۸۔ اصل موقع ومحل تک رسائی نہ ہو سکی جس کی وجہ سے بھی احکام کی توجیہ میں اختلاف رونما ہوا۔

۹۔ بعض فقہاء نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو قانونی و عملی حیثیت دی اور بعض نے آپ کے فعل کو خصوصیات نبی پر محمول کیا۔

۱۰۔ حکم کی علت کے تعیین میں بھی اختلاف رہا کسی نے کچھ علت قرار دی اور کسی نے کچھ۔

۱۱۔ خبر احاد کی قبولیت میں اختلاف۔ بعض فقہاء نے اس سے حجت لی اور اسی پر احکام مرتب کیے اور بعض نے اس سے اختلاف کیا جس کی وجہ سے کئی مسائل مختلف فیہ بن گئے۔

۱۲۔ نظم قرآن کے وجوہ استعمال اور معانی کے سمجھنے میں اختلاف مثلاً بعض فقہاء نے لفظ قروء کے معنی طہر کے لیا اور بعض نے اس کے معنی حیض کے لیے۔ اسی طرح مس، لمس اور نکاح وغیرہ جیسے الفاظ میں بعض

فقہا نے ان کے مجازی معنی مراد لیے اور بعض نے حقیقی معنی ہی کو ملحوظ رکھا۔ بعض فقہا نے کتاب اللہ کے حکم مطلق کو اپنے اطلاق پر باقی رکھا اور اس حکم مطلق پر کسی زیادتی کو جائز نہ سمجھا اور بعض نے اس پر حدیث مشہور و متواتر سے زیادتی کی اور اس کو مناسب جانا، اسی طرح کتاب اللہ کے حکم مقید کو بعض نے مقید ہی رکھا اور بعض نے ایسا نہیں کیا جس کی وجہ سے کئی مسائل میں اختلاف پیدا ہوا۔ اس نوع کے سارے تفصیلات ایک مستقل علم "علم اصول فقہ" میں موجود ہیں اور سارے کتب فقہ ان سے بھرے پڑے ہیں۔

۱۳۔ (الف) صحابی نے اپنے اجتہاد سے کوئی حکم فرمایا لیکن دیگر اصحاب کے پاس اس اجتہادی مسئلہ میں حدیث موجود تھی اور اجتہادی حکم حکم حدیث کے خلاف تھا تو صحابی نے حدیث پر عمل کیا اور حکم اجتہادی سے رجوع کر لیا (ب) حکم اجتہادی کے خلاف 'صحیح حدیث' دریافت نہ ہو سکی لیکن اجتہادی حکم کے مقابلہ میں وہ حدیث قوی تھی لہٰذا اس صورت میں اس حدیث پر عمل کیا گیا اور حکم اجتہادی کو نظر انداز کر دیا گیا۔ (ج) حکم اجتہادی کے خلاف کوئی ایسی حدیث نہیں تھی کہ جس سے قلبی اطمینان حاصل ہو اور جس کے ذریعہ حکم اجتہادی کے خلاف تقویت پہنچتی ہو ایسی صورت میں اجتہادی حکم پر عمل کیا گیا اور حدیث کو چھوڑ دیا گیا۔ (د) حدیث تو موجود تھی لیکن بعض اصحاب تک نہیں پہنچ سکی اور لاعلمی کی وجہ سے اجتہاد سے حکم لگایا گیا اور اسی پر عمل درآمد ہو گیا۔

۱۴۔ 'تعامل الناس'، عرف و عادت، رواج اور ملکی قوانین کی وجہ سے بھی بعض مسائل میں اختلاف پیدا ہوا۔ اسی طرح حضرت امام مالکؒ کے پاس "قیاس مرسل" اور حضرت امام اعظمؒ کے پاس "استحسان" جائز اور نافذ العمل ہے۔ لیکن حضرت امام شافعیؒ اس کے قائل نہیں۔

استحسان اور قیاس مرسل کا مطلب یہ ہے کہ مجتہد اپنے اجتہاد فکریہ سے ادلہ شرعیہ کی روشنی میں بہ تقاضائے حالات انسانی فلاح و بہبود کے لیے مفید تدبیریں اور نئی راہیں اختیار کرے۔ شریعت بیضا کا منشا بھی یہی ہے کہ اس کے ماننے والوں کو سہولت و آسانی مہیا کی جائے تاکہ وہ زندگی کی ہر دوڑ میں کسی سے پیچھے نہ رہیں اور دراصل دین نام ہے "خیر خواہی اور آسانی کا" ارشاد باری ہے:۔ یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر، وما جعل علیکم فی الدین من حرج۔ اسی طرح جواز استحسان میں متعدد احادیث و روایات وارد ہیں۔ "لا تجتمع امتی علی الضلالۃ" میری امت ضلالت اور گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی۔ ما راٰہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن، اور ایک دوسری حدیث میں ہے "من سن سنۃ حسنۃ فلہ اجر عمل بھا و من عمل علیھا" ایک اور حدیث ہے: الحکمۃ ضالۃ المؤمن فھو احق بھا حیث وجدھا۔ غرض کہ ان احادیث و روایات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے حالات کے ہر نئے موڑ پر مسلمانوں کی کس قدر صحیح رہنمائی کی ہے اور ہر اچھی و مفید چیز کے

حصول و عمل کی کس درجہ ترغیب دی ہے اور یہی دینِ فطرت کا تقاضہ ہے۔

اب آپ ان علمی و اجتہادی اختلافات سے صحیح اندازہ کر سکتے ہیں کہ فقہا میں اختلاف کیوں اور کن اسباب و علل کی بناء پر ہوا۔ ظاہر ہے کہ ہر ایک فقیہہ نے شریعت ہی کے منشاء کو پیش رکھا اور اسی لحاظ سے احکام متعلق کئے اور مصالحِ انسانی کو پیشِ نظر رکھا۔ علامہ ابن قیمؒ نے اس باب میں بہت صحیح فیصلہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"شریعت کی بنیاد حکمتوں اور لوگوں کی دنیاوی اور اُخروی فلاح و بہبود پر ہے اور شریعت سراسر رحمت و حکمت ہے۔ پس جس مسئلہ میں انصاف کے بجائے ظلم ہو، رحمت کے بجائے زحمت ہو، فائدے کی بجائے نقصان ہو اور عقل کی بجائے بے عقلی ہو، وہ شریعت کا مسئلہ نہیں۔ احکام میں تبدیلی اور اختلافِ زمان و مکان، احوال و نیت اور عادات انسانی کے ساتھ وابستہ ہے۔"

وہ مزید لکھتے ہیں:۔

"معاشرہ انسانی اور قانون کا باہمی رشتہ نہیں جاننے کے باعث لوگوں میں ایک غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے جس نے شریعت کا دائرہ محدود کر دیا ہے حالانکہ حقیقت ایسی نہیں ہے۔ جس شریعت میں مصالح انسانی کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہو اس میں ان تنگ نظریوں کی گنجائش نہیں۔"[1]

ہماری اس تمام بحث سے مقصود یہ ہے کہ فقہائے کرام میں جو مسائلی اختلاف ہے وہ انھیں مصالح اور حکمتوں پر مبنی ہے جس کے نتیجے میں مذاہب اربعہ وجود میں آئے جن پر آج سوادِ اعظم گامزن ہے۔ انھیں کے مجموعہ کو "اہل السنۃ والجماعت" کہا جاتا ہے۔ فقہائے کرام کا اختلاف اس لحاظ سے بھی رحمت ہے کہ انھوں نے استنباط مسائل و احکام کا طریقہ اور اس کے اصول و ضوابط وضع کر کے امت کے لیے بڑی سہولت اور آسانی پیدا کر دی اور مزید تحقیق و تلاش کی جانب ہماری صحیح رہنمائی کی۔

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

---

[1] اعلام الموقعین ج ۳ ص ۱۔

اسلام کا اجتماعی نظام

مولانا محمد وجیہ الدین صاحب (کامل نظامیہ)
معزز رکن مجلس انتظامی جامعہ نظامیہ

حامداً و مصلیاً - علوم عمرانی کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے - اور انسان کی ساری ترقیوں کا انحصار اسی پر ہے کہ وہ اجتماعی زندگی گزارے - اگر انسان بھی اور حیوانات کی طرح الگ الگ رہتے، ایک دوسرے کی مدد نہ کرتے اور بعض بعض کے تجربوں سے فائدہ نہ اٹھاتے تو موجودہ ساری ترقیاں خواب میں بھی نظر نہ آتیں -

تاریخ کی ورق گردانی کیجئے تو معلوم ہوگا کہ پچھلی قوموں میں وہی قومیں زیادہ متمدن اور ترقی یافتہ ہوئیں جن کا اجتماعی نظام اچھا تھا - یا یوں کہئے کہ جن قوموں کا اجتماعی نظام جتنا اچھا رہا اتنی ہی ان کو ترقی ہوئی اس لیے جو قوم ترقی کرنا چاہتی ہے اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ پہلے اپنے اجتماعی نظام کو ٹھیک کرے -

لامذہبیت کے اس دور میں جب کوئی چیز مذہب کے نام سے سامنے آتی ہے تو وہ سب سے زیادہ ہدف ملامت بنتی ہے لیکن جہالت کی ان ظلمتوں سے حقایق کا آفتاب چھپ نہیں سکتا - قدیم مذاہب حقہ اور ان کے اثرات کو تاریخی نقطہ نظر سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ انسان کی موجودہ ساری ترقیوں کا دارومدار ان برگزیدہ ہستیوں ہی کی تعلیمات کا رہین منت ہے جن کو دنیا انبیاء علیہم السلام کے نام سے پکارتی ہے - اگر کوئی بے دین ولامذہب انسان اس کا انکار کرے تو اس سے حقیقت نہیں بدل سکتی - بقول سعدی علیہ الرحمہ کے ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم — چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

الحاصل تمام مذاہب حقہ نے انسان کی فلاح و بہبود و ترقی کے لیے جو باتیں بتائیں ان میں سے ایک اہم بات اجتماعی نظام کی خوبی اور اجتماعی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانا تھا - چونکہ تمام مذاہب حقہ میں اسلام سب سے آخری اور سب سے مکمل اور فطری مذہب ہے - اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا اجتماعی نظام سب سے اچھا اور انسانیت کے لیے سب سے زیادہ فائدہ مند ہے -

انسان دیکھنے میں تو ایک چھوٹی سی مخلوق ہے - مگر اس کی صلاحیتوں اور خصوصیات کے اعتبار سے ایک عالم اصغر ہے - اس لیے اس کی زندگی کے مسائل اتنے گوناگوں ہیں کہ اگر ان پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے یہی وجہ ہے کہ صرف انسانی زندگی کے ایک شعبہ عمرانیات پر سیکڑوں نہیں ہزاروں کتابیں لکھی گئیں پھر بھی تشنگی باقی ہے - اس لیے ہم صرف اس کے ایک جزء سے بحث کریں گے -

سب سے پہلے اسلام نے یہ بتایا کہ تمام انسان مرتبہ اول میں ایک ہیں یعنے بہ اعتبار تخلیق سب انسان ہم رتبہ ہیں کسی کو کسی پر فوقیت نہیں - حسب و نسب، رنگ، ذات پات، ملک و قوم میں سے کوئی چیز بھی ایک انسان کو

دوسرے پر فوقیت نہیں دلا سکتی۔ ثانوی درجے میں انسانی جماعت کی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں۔ ایک وہ جو اپنے خالق کی اطاعت گزار اور فرمانبردار ہے اور دوسری وہ جو نافرمان اور سرکش ہے۔

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے نہ وہ کسی خطہ ارضی تک محدود ہے نہ کسی رنگ و نسل کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان دُنیا کے ہر حصّے میں پائے جاتے ہیں اور ہر قوم و نسل کے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہیں فرق ہے تو یہ کہ وہ کہیں اقلیت میں ہیں اور کہیں اکثریت میں ظاہر ہے کہ ان دونوں صورتوں میں مسلمانوں کا اجتماعی نظام یکساں نہیں ہو سکتا۔ جہاں اکثریت میں ہیں وہاں کی حکومت مسلمانوں کی مرضی کے تابع ہوگی اس لیے وہاں کے اجتماعی نظام کی صورت یہ ہوگی کہ وہاں کے تمام نظام مذہبی، معاشی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، تعزیری اور تشریعی وغیرہ سب کے سب احکام اسلام کے مطابق ہوں گے۔ جو قرآن و حدیث اور فقہ سے ماخوذ ہوں گے۔ اور جہاں اقلیت میں ہوں وہاں ان کو اس قسم کی آزادی نہیں مل سکتی کہ اسلام کے پورے قوانین ملک میں نافذ کر سکیں اس لیے ان کو ایک ایسے نظام کو اختیار کرنا پڑے گا جو ان کو ایک پُر امن شہری بن کر زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کرے۔

موجودہ دَور جمہوری ہے جس میں اقلیت و اکثریت کی اصطلاح چل پڑی ہے آج کل تمام دنیا اور دُنیا والوں میں ایک ایسا تغیر آگیا ہے جو آج سے دو چار صدی پہلے نہیں تھا۔ کم و بیش دُنیا کی سب حکومتیں یہی کہتی ہیں کہ ہم کو مذہب سے واسطہ نہیں۔ ہر ایک کو مذہبی آزادی ہے۔ حکومت کسی فرد کے ذاتی معاملات میں مداخلت نہیں کرتی۔ یا بالفاظِ دیگر ہر مذہب والے کے "پرسنل لا" کا احترام کیا جائے گا۔ حکومت اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کرے گی۔ یہ صرف زبانی باتیں نہیں بلکہ دستور میں درج ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کسی مملکت میں اس پر خلوص سے عمل ہوتا ہے۔ اور کہیں اس میں کوتاہی برتی جاتی ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اگر عملی صورت کو نظر انداز کر کے دیکھیں تو قولاً تمام دنیا میں کوئی ملک سوائے اسرائیل کے دار الحرب نہیں ہے۔ اگر کسی ملک کو دار الحرب کہیں تو لازم آئے گا کہ مُسلمان وہاں سے ہجرت کریں ان کو دار الحرب میں مستقل سکونت کی اجازت نہیں ہے۔

اسلام کے اجتماعی نظام کی بُنیاد اس آیت پر ہے۔ "اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔" اجتماعی زندگی کو پُر امن اور تمام افراد کے لیے یکساں طور پر آرام دہ بنانے کے لیے یہ ضروری ہے، کہ کچھ قوانین بنائے جائیں اور ان پر سختی سے عمل کیا جائے۔ اگر یہ نہ ہو تو افراد اپنے مقاصد و اغراض کو اولیت دینے لگیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ چند دوسروں کے مقاصد و اغراض سے ان کا تصادم ہوگا۔ اور بد امنی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ اسلام نے واضح طور پر بتایا کہ قانون سازی کا اختیار اللہ تعالیٰ کو ہے اس لیے کہ وہی حاکم اصلی ہے۔ اور اقتدارِ اعلیٰ اسی کو حاصل ہے۔ بنا بریں اللہ تعالیٰ نے ایک قانون کی جامع کتاب اپنے خاص رسولؐ کے ذریعے بندوں کے پاس روانہ کی۔ وہی اسلامی قوانین کی اساس ہے جس کے ذریعے

مجموعہ قوانین آیا تھا۔ اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قوانین کی قولاً و عملاً تشریح بھی کی اور ایک کثیر جماعت کو اس پر عمل پیرا بھی کرا دیا۔

اللہ اور رسول کی اطاعت کے بعد تیسرا درجہ اطاعت اولی الامر کا ہے۔ اجتماعی زندگی میں ایک امیر کی ضرورت ہے اور یہ ایک فطری ضرورت ہے۔ اسی لیے امیری اور سرداری کا طریقہ انسان کے بالکل ابتدائی تمدن کے زمانے ہی سے رائج ہے۔ انسان کی تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہیں اور امیر کے نام بھی بدلتے رہے۔ کبھی وہ سردار کہلایا۔ کبھی بادشاہ، کبھی آمر کبھی اور کچھ۔ مگر ہے وہی نظم و ضبط کا سربراہ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں وہی امیر جماعت بھی تھے اور وہی حکمرانِ وقت بھی۔ وہی قانون ساز بھی تھے اور وہی اقتدار اعلیٰ کا سرچشمہ بھی۔ لیکن اس لیے نہیں کہ آپ مقتدرِ اعلیٰ تھے بلکہ اس لیے کہ مقتدرِ اعلیٰ یعنے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو براہِ راست احکام ملتے تھے۔ اور آپ ان احکام کو صرف نافذ فرماتے تھے۔ "وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی۔" حضور کے انتقال کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ کے جانشین یعنے خلیفہ مقرر ہوئے۔ مگر حیثیت بدل چکی تھی۔ آپ صرف امیر تھے۔ اقتدارِ اعلیٰ کے حامل نہیں۔ یعنے آپ کو صرف قوانین مقررہ کے نفاذ کا حق و اقتدار تھا۔ قوانین میں رد و بدل کا نہیں۔ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ اگر کوئی ایسا معاملہ درپیش ہو جس کا حل مقررہ قوانین میں نہ مل سکے تو اس کے لیے اہل الرائے کے مشورہ سے اپنا حکم نافذ کر سکتے تھے۔ "وامرھم شوریٰ بینھم" ان پر دوسری پابندی یہ تھی کہ اپنے اعمال کے لیے جماعت کے سامنے جواب دہ تھے۔ یعنے امیر کے کسی عمل پر جماعت کا کوئی فرد اعتراض کرے تو امیر کا فرض ہے کہ اس اعتراض کو رفع کر کے معترض کو مطمئن کرے۔ خلافتِ راشدہ تک یہی عمل رہا۔ اور یہی اسلام کی اجتماعی زندگی کا اصول ہے۔

اسلام میں انتخابِ امیر کے لیے کیا اصول ہیں اور انتخاب کا طریقہ کیا ہونا چاہیئے یہ ایک طویل بحث ہے۔ اس پر پھر کبھی روشنی ڈالی جائے گی۔ اس وقت صرف یہ معلوم ہونا کافی ہے کہ اسلام نے امیر کی ضرورت اس شد و مد سے جتائی ہے کہ دوسرا کوئی مذہب اس بارے میں اتنا زور نہیں دیتا۔ مثلاً اس کے بنیادی احکام یعنے نماز، روزہ، حج اور زکواۃ کو لیجئے۔ نماز پنجگانہ میں امام کی ضرورت سے تو سبھی واقف ہیں لیکن یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ کسی ملک یا کسی بستی میں جمعہ اور عیدین کی نماز ادا کرنے کے لیے بھی امیر کی اجازت شرط ہے۔ جہاں کوئی امیر ہی نہیں وہاں لوگ جمعہ اور عیدین کی نماز پڑھ تو لیتے ہیں مگر یہ مشتبہ ہے کہ ان کی نماز ادا ہوتی بھی ہے یا نہیں۔ روزہ کی ابتدا اور اس کے ختم کے لیے امیر کی اجازت درکار ہے۔ حج کے لیے بھی امیر الحج کا تقرر ضروری ہے۔ اور اسی پر عمل درآمد ہے۔ ان کے علاوہ کئی ایسے ضروری امور ہیں جن کی انجام دہی کے لیے امیر کی ضرورت ہے۔

اس باب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بہ کثرت ارشادات وارد ہیں۔ حتیٰ کہ آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اگر دو تین آدمی سفر کو نکلیں تو ان میں سے ایک کو امیر بنا لیا جائے۔ مسلمان تو شاید ہی اس پر عمل کرتے ہوں سوائے ایک تبلیغی جماعت کے۔ البتہ یہ سُنا ہے کہ مغربی قومیں اس کی پابند ہیں۔

اس وقت دُنیا میں مسلمان کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ اور اُن کی برائے نام خود مختار سلطنتیں بھی ہیں۔ لیکن دُنیا میں ان کا کوئی مقام بھی ہے؟ کیا عالمی سیاست میں ان کا کچھ اثر بھی ہے؟ مسلمانوں نے کبھی یہ بھی سوچا کہ ساری دُنیا میں وہ کم و بیش اسی کروڑ ہیں۔ اس کے باوجود ان کا یہ حال کیوں؟ وجہ صرف یہ ہے کہ ان میں مرکزیت نہیں۔ ان کے خیالات میں ہم آہنگی نہیں۔ وہ کسی مسئلہ میں ایک رائے پر متفق نہیں ہو سکتے۔ اسلام نے تو تعلیم دی تھی "انما المومنون اخوۃ" لیکن آج کوئی اس کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں۔ ان میں اتفاق نہیں۔ نفاق و شقاق کے سوا اور کچھ نہیں، سوچئے اس کا انجام سامنے ہے۔ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ نفاق و شقاق تو مسلمانوں میں قرنِ اول ہی سے چلا آرہا ہے۔ یہ کوئی نئی بات تھوڑی ہی ہے۔ لیکن یہ غور کرنا ضروری ہے کہ پچھلے اور موجودہ حالات میں فرق کیا ہے؟ مناسب ہوگا کہ اس فرق کو سمجھنے کے لیے کچھ ماضی کی طرف رجوع کریں۔

یہ سب ہی جانتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں خانہ جنگی شروع ہوئی ہزاروں مسلمان مارے گئے۔ ایسی شدید باہمی مخالفت کے زمانے میں رومی بادشاہ کو اس کے درباریوں نے مشورہ دیا کہ مسلمان خانہ جنگی کی وجہ سے کمزور پڑ گئے ہیں ایسے وقت میں اگر ہم ان پر حملہ کر دیں تو ان سے پُرانی شکستوں کا بدلہ لیا جا سکتا ہے۔ اور ہم ان سے اپنے مقبوضات واپس لے سکتے ہیں۔ بادشاہ نے ایک دربار منعقد کیا۔ اور دو کتوں کو آپس میں لڑوا دیا۔ جب دونوں کتے آپس میں بڑی خونخواری سے لڑ رہے تھے تو اس وقت ایک بھیڑیئے کو ان کے سامنے چھوڑوا دیا۔ کتے بھیڑیئے کو دیکھتے ہی آپس میں لڑنا چھوڑ کر بھیڑیئے پر جھپٹ پڑے اور دونوں نے مل کر تھوڑی دیر میں اس کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے اپنے مشیروں سے کہا کہ یہی حال مسلمانوں کا ہے۔ اگر ہم نے ان کو چھیڑا تو یہ اپنی باہمی لڑائی چھوڑ کر پہلے ہم سے نبٹیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ان کو آپس ہی میں لڑ کر کمزور ہونے دیا جائے۔

بنو ہاشم اور بنی امیہ کی کشمکش شروع ہوئی۔ بنو عباس ایشیا اور افریقہ کے تمام علاقوں پر قابض ہو گئے۔ مگر اندلس ان کے قبضہ میں نہ آسکا۔ بنو عباس کے کئی حکمرانوں نے کوشش کی کہ اندلس کے حکمران بنو عباس کی خلافت اور سیادت کو برائے نام ہی قبول کر لیں۔ لیکن اندلس کے حکمران راضی نہیں ہوئے۔ ابتدا کے بعض فرمانرواؤں نے تو کچھ احتیاط برتی یعنے اپنے آپ کو صرف امیر کہتے رہے۔ اگرچہ کہ یہ بھی اسلام کے احکام کی خلاف ورزی اور مرکز گریزی تھی، مگر بعد والے تو

اس سے بھی آگے بڑھ گئے اور اپنے آپ کو خلیفہ کہنے لگے۔ اس مرکز گریزی کا انجام اہل اندلس نے دیکھ لیا۔ اندلس کے مسلمانوں کی حالت پر اب تک لوگ افسوس کرتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس جرم عظیم یعنی مرکز گریزی اور جماعت سے کٹ جانے کی سزا کتنے صدی بعد دی۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ حلیم ہے۔ کسی جرم کی سزا فوراً نہیں دیتا۔ یہی حال شمالی افریقہ کا ہے۔ یہاں بنو فاطمہ نے خلافت قایم کی۔ اور بنو عباس کے حریف بنے رہے۔ تھوڑی سی مہلت ان کو بھی ملی مگر انجام وہی کہ اللہ تعالیٰ کا قانون نہیں بدلتا۔

خلافت عباسیہ بغداد میں صدیوں قایم رہی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ تمام خلفاء نہایت مدبر حکومت کے اہل اور طاقتور تھے۔ بلکہ اصل سبب یہ ہے کہ یہاں کے مسلمان ایک مرکزیت کو باقی رکھنا چاہتے تھے، چاہے وہ مرکز کمزور ہی کیوں نہ ہو۔ حتیٰ کہ بنو عباس کے سخت مخالفین نے بھی اسی مرکزیت کو باقی رکھا۔ لیکن جب اس مرکزیت کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی تو تاتاریوں کا طوفان اللہ کا غضب بن کر آیا۔ اور اس سے جو تباہی ہوئی اس سے سب ہی واقف ہیں۔

مرکز بغداد ختم ہوا اور مسلمانوں کو اس کی فکر ہوئی۔ اور جیسے ہی اس طوفان کا زور ٹوٹا، دوبارہ مرکز قایم کرنے کی سعی شروع ہو گئی۔ چونکہ عراق وغیرہ کی حالت ابتر تھی بر خلاف اس کے مصر میں ایک مستحکم حکومت قایم تھی اس لیے مرکز خلافت مصر قرار دیا گیا۔ اور ایک عرصہ تک یہی رہا۔ پھر عثمان ترکوں کے زمانے میں قسطنطنیہ منتقل ہو گیا اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے سلف کو یہ گوارا نہیں تھا کہ ان کی مرکزیت ختم ہو جائے۔ تاتاری حملے میں خلافت کو ختم ہو کر چند سال بھی نہیں گزرے تھے کہ دوبارہ خلافت قایم کر دی گئی۔ یہ اصل میں ان کی مرکزیت پسندی کا جذبہ تھا۔

پہلی عالمگیر لڑائی کے بعد ترکوں میں سخت انقلاب آیا۔ اور اس کے ساتھ ہی خلافت میں بھی، پھر کچھ عرصہ بعد خلافت ختم ہی کر دی گئی۔ اس واقعہ کو گزرے ہوئے تقریباً نصف صدی کا زمانہ ہو رہا ہے۔ اس کے بعد سے نہ مسلمانوں میں مرکزیت ہے نہ اس کے پیدا کرنے کی خواہش۔ جن حالات میں مصطفےٰ کمال مرحوم نے خلافت کو ختم کیا ان پر نظر رکھتے ہوئے اس عمل کو قابل اعتراض نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ پھر بھی ایک بات ضرور کہنی پڑتی ہے کہ خلافت اسلامیہ ترکوں کا کوئی خانگی معاملہ نہیں تھا۔ اس کا تعلق تمام دنیا کے مسلمانوں سے تھا۔ اس لیے خلافت کو ختم کرنے سے پہلے تمام مسلم ممالک کے نمایندوں کو مدعو کر کے ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا جاتا۔ اور ان کو بتایا جاتا کہ صدیوں سے ترکی قوم خلافت کا بار اٹھاتی رہی اب بعض مصالح کی بنا پر وہ اس بار سے سبکدوش ہونا چاہتی ہے ایسی صورت میں تمام عالم کے مسلمانوں کی رائے کیا ہے۔ ممکن تھا کہ اس وقت سب کے مشورہ سے کوئی بہتر صورت نکل آتی اور اور اتنے طویل عرصے تک مسلمان بغیر امیر اور مرکزیت کے نہ رہتے۔

اس ساری بحث کا ماحصل یہ نہیں کہ ہم اس شعر کا مصداق بن جائیں ؎

بڑے شوق سے سُن رہا تھا زمانہ ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

بلکہ یہ بتاتا ہے کہ اسلام کا اجتماعی نظام کسی ملک، قوم یا زمانے تک محدود نہیں۔ بلکہ ہر وقت ہر جگہ اور ہر حالت میں مفید اور کارآمد ہے بشرطیکہ اس نظام پر پوری طرح عمل کیا جائے۔ وہ ممالک جہاں مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہے اس نظام کو اپنا کر فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ البتہ وہ ممالک جہاں کے اقتدار میں مسلمان فیصلہ کن عنصر کی حیثیت نہیں رکھتے اس قابل ہیں کہ وہاں اجتماعی نظام کے بارے میں کچھ اظہارِ خیال کیا جائے۔

اوپر بتایا گیا کہ سیاسی اقتدار سے ہٹ کر بعض دینی اور شرعی امور ایسے ہیں جن کے لیے ایک مُسلم امیر کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے علمائے سلف نے صراحت کی ہے کہ ایسے اُمور کی انجام دہی کے لیے یہ ضروری ہے کہ مسلمان اپنا ایک امیر منتخب کر لیں اور وہ امیر ان اُمور کو انجام دے اور سب مسلمان اس کی اطاعت کریں۔ ہندستان میں انگریزوں کی حکومت قایم ہونے کے بعد سے اس طرف توجہ نہیں کی گئی۔ اب اس وقت اس کی شدید ضرورت اس لیے ہے کہ انتشار وافتراق کی وجہ سے کئی دینی امور میں خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں جن کا اثر معاشرہ پر بہت بُرا پڑ رہا ہے۔ اگر ان کی اصلاح نہ کی گئی تو یہی کہنا پڑے گا ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندستاں والو تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اس وقت ہندستان میں مسلمانوں کی کئی جماعتیں ہیں۔ اور ہر جماعت اپنے اپنے مقاصد بھی رکھتی ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہندستان کی تمام مسلم تنظیمیں خواہ وہ کسی فرقے، گروہ یا جماعت سے علاقہ رکھتی ہوں ایک مقصد کے لیے جمع ہو جائیں اور وہ مقصد ہو خالص دینی یعنے تمام مسلمانوں کا ایک امیر منتخب کیا جائے۔ اور اس کی مجلس مشاورت میں ہر جماعت کے نمائندے ہوں۔ اس طرح یہ ثابت کیا جا سکے گا کہ تمام مسلمان ایک جماعت ہی نہیں بلکہ ایک جسدِ واحد ہیں۔ اس تجویز پر پورے ہندستان کے مسلمان فی الوقت اور فوراً عمل کریں گے اس کی توقع کم ہے البتہ یہ ممکن بھی ہے اور آسان بھی کہ ہندستان کے بڑے بڑے شہروں میں اس تجویز پر عمل کیا جائے۔ اگر یہ تجویز بار آور ہو گئی اور بڑے شہروں کے مسلمان ایک امیر کی اطاعت پر آمادہ ہو گئے تو اس کو توسیع دے کر ریاستوں کے لیے بھی یہ نظام قایم کیا جا سکتا ہے۔

الحاصل مسلمانوں کو اس شیطانی پروپگنڈے سے متاثر نہیں ہونا چاہیے کہ اسلام کے احکام اس زمانے کے لیے موزوں نہیں ہیں اس لیے کہ زمانہ بہت ترقی کر گیا ہے۔ وہ تو ہر زمانے کے لیے موزوں ہی نہیں بلکہ مفید اور ناگزیر بھی ہیں۔ لیکن شرط ان پر عمل کرنے کی ہے۔

اُٹھو ورنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

نکاح کا اسلامی تصور

مولوی خواجہ شریف صاحب
استاذ جامعہ نظامیہ

نکاح تمدن و معاشرت کا ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ نوع انسانی کا وجود، بقائے نسل، عفت و پاکیزگی، راحت و سکون، تدبیر منزل اور سوسائٹی کا نظام نکاح سے قایم ہے۔ قدرت نے مرد و عورت میں ایک دوسرے کی طرف جذب و کشش کی بے پناہ قوت ودیعت فرمائی ہے تاکہ دنیا جنس انسانی سے خالی نہ ہو جائے۔ اس قوت کے جائز استعمال کا نام نکاح (شادی) ہے اور اس کے خلاف عمل بدکاری ہے اور مذہبی، سماجی و اخلاقی لحاظ سے بدترین گناہ ہے۔

نکاح کی بنیاد پر تعمیر ہونے والی ازدواجی زندگی کو نظام حیات میں بنیادی مقام حاصل ہے۔ اس کے بگاڑ سے سارے نظام میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے اور اگر یہ منضبط و درست ہو تو ساری زندگی میں نظم و ضبط اور توازن قایم ہو جاتا ہے۔

اسلام نے نکاح کی نہ صرف ترغیب دی ہے بلکہ بعض مواقع پر فرض اور واجب قرار دیا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "النکاح سنتی فمن رغب عن سنتی فقد رغب عنی" (ابویعلی) نکاح میری سنت ہے جس نے میری سنت سے منہ موڑا اس نے مجھ سے منہ موڑا۔ علمائے احناف نے بتایا ہے کہ نفل عبادت کے لیے تنہائی اختیار کرنے سے بہتر یہ ہے کہ آدمی نکاح کرے۔ نکاح کی یہ فضیلت مرد، عورت غیر شادی شدہ اور بیوہ سب کے لیے ہے۔ بیوہ کا نکاح معیوب نہیں بلکہ قرآن نے حکم دیا ہے کہ "وانکحوا الایامی منکم" (النور) اور تم بیواؤں کا اپنے لوگوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کرا دو۔

نکاح کے لیے نسبت کا انتخاب بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انتخاب جیسا ہوگا زندگی ویسی ہوگی۔ خوشگوار زندگی کے لیے بہتر انتخاب ضروری ہے۔ محض مال و دولت یا حسن و جمال کی بنیاد پر نسبت قایم کی جائے تو چونکہ دولت زوال پذیر ہے اور حسن بھی ڈھلتی چھاؤں ہے تو اس نسبت سے قایم ہونے والی زندگی کی بہاریں بھی وقتی اور جلد ختم ہونے والی ہوں گی۔ خوشگوار فضا ناخوشگواری میں بدل جائے گی۔ واقعات شاہد ہیں کہ وہ گھرانے اختلاف کدہ اور عذاب گھر بنے ہیں جہاں مال و جمال کی بنیاد پر نسبت قایم ہوئی تھی۔ اسی لیے اخلاق و دینداری کو بہرحال ملحوظ رکھنا چاہیے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تنکح المرأۃ لمالہا وجمالہا وحسبہا ودینہا فعلیک بذات الدین تربت یداک۔" عورت سے مال، جمال، نسب اور دین کو دیکھ کر نکاح کیا جاتا ہے لیکن تو پہلے دینداری کو دیکھ۔ اگر عورت دیندار، تعلیم و تربیت یافتہ ہو گی تو فراخ و تنگی دونوں حالتوں میں شکر و قناعت کی

پُرسکون زندگی میسر ہوگی۔

اسلام میں نکاح ایک محض رسم ہی نہیں بلکہ وہ ایک مقدس رشتہ، دوامی و غیر موقتی معاملہ و معاہدہ ہے اسی لیے اس میں معاملہ کے دونوں فریق عاقدین کی مرضی کو زبردست اہمیت دی گئی ہے۔ اگر لڑکی عاقلہ و بالغہ ہے تو قریب ترین رشتہ دار ماں یا باپ بھی لڑکی کی مرضی کے خلاف کوئی نسبت قایم نہیں کرسکتے اس کے برعکس لڑکی اپنی مرضی سے مناسب رشتہ تلاش کرسکتی ہے۔ البتہ اگر لڑکی نظام خاندان کے خلاف غیر کفوٗ میں نامناسب رشتہ قایم کرے تو والد کو فسخ کرانے کا حق حاصل ہے۔ اور چونکہ مستقبل کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے والے لڑکا اور لڑکی ہی ہوتے ہیں اور پُرمسرت زندگی دونوں ہی کے کردار پر منحصر ہے اس لیے لڑکا اور لڑکی کی پسند ہی قابل ترجیح ہوگی۔ چنانچہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کی مرضی کے خلاف ہونے والے ایک رشتہ کو فسخ بھی کرادیا تھا اور آپؐ نے فرمایا نکاح سے پہلے تم اس عورت کو دیکھ لیا کرو۔

ہمارے معاشرے اور سماج نے نکاح کے بارے میں عاقدین کی مرضی کو نظرانداز کردیا اور اس کا افسوسناک پہلو تو یہ ہے کہ نسبت کے معاملہ میں لڑکے اور لڑکی کے مشورے یا رائے کو معیوب سمجھا جانے لگا اور ایک ایسے لڑکے اور لڑکی کے مستقبل کی ساری ذمہ داریوں کے ساتھ ایک دوسرے کے حوالے کردیا جاتا ہے جنھیں ایک دوسرے سے واقف ہونے کا کوئی موقع نہیں ملا اور ایسی ہی بہت سی غیر شرعی پابندیاں عائد کردی گئیں۔ جس میں عاقدین کا مفاد کم ہی پیشِ نظر رہا۔

عورت کو اسلام کے عطا کردہ حقوق اور اس کی اسلامی آزادی کو نظرانداز کردینے کا نتیجہ ہے کہ آج مغربی طرزِ نکاح اور لو میرج کا رجحان بڑھتا جارہا ہے۔ یہ صورتِ حال علمائے کرام اور ذمہ دارانِ قوم کی مستحق توجہ ہے۔

اسلام چونکہ ایک فطری مذہب ہے اس لیے اس نے نکاح کو بھی اصولِ فطرت کے مطابق نہایت سادہ اور آسان بنایا ہے۔ عاقدین دو گواہوں کی موجودگی میں بذاتِ خود یا کسی وکیل کے ذریعے ایجاب قبول کریں اور مہر کی کوئی رقم منظور کرلیں تو نکاح ہوجاتا ہے ـــــ مہر ایک ضروری رقم ہے عاقدین بوقت عقد مہر کے نہ ہونے پر اتفاق بھی کرلیں تو مہر مثل لازم آتا ہے جس کی تفصیل کتبِ فقہ میں موجود ہے۔

مہر کا کم ہونا اچھا ہے لیکن اس پر کوئی تحدید عائد نہیں کی جاسکتی۔ مہر پر پابندی عائد کرنا عورت کے حقوق میں مداخلت ہے کیونکہ عورت کو زیادہ سے زیادہ مہر کا حق حاصل ہے۔ ایک دفعہ عمر فاروقؓ نے مہر پر تحدید کا اظہارِ خیال فرمایا تب ایک بوڑھیا نے تنقید کی عمر فاروقؓ نے فرمایا بوڑھیا نے ٹھیک کہا اور عمرؓ نے غلطی کی۔ بہرحال مرد اپنی استطاعت کو ضرور ملحوظ رکھے اور جلد ادا کرے خواہ مخواہ زیادہ مہر مقرر کرنا اور عورت سے معاف کرانا نامناسب اور مرد کے قوام ہونے کے خلاف ہے۔

برادران اسلام! شادی کے معاملے میں ہمارا رویہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کے خلاف رہا ہے۔ بیانڈ، باجا، آتش بازی، عورتوں کا بلند آواز سے گیت گانا۔ ریکارڈنگ، ڈھنگانا، وارن پھیرن اور بعض دنوں کو منحوس اور نامبارک تصور کرنا نہ صرف ناجائز بلکہ گناہ ہیں۔ مانجھا اور جھگی کا لزوم ایک نہایت بیہودہ رسم ہے اور عورت کے لیے فرائض اور نمازوں کی ادائی میں ایک رکاوٹ ہے۔ جوڑے کے مطالبے نے تو کئی پیچیدہ مسائل کو جنم دیا ہے اور دن بہ دن صورت حال خطرناک ہوتی جارہی ہے۔ برا ہو اس رسم نامرضیہ اور ان غیر اسلامی بندھنوں کا کہ اس نے کئی ایک ناکتخدا لڑکیوں کو نکاح اور پر لطف زندگی سے محروم کردیا۔ لباس کا جوڑا ایک آسان مسئلہ ہے۔ ایک دوسرے پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ زیادہ افسوسناک پہلو تو یہ ہے کہ جوڑے کی رسم نے ساری ذمہ داری بے چاری عورت پر ڈال دی ہے حالانکہ عورت ہی زیادہ مستحق تعاون ہے۔ مرد کے لیے جوڑے کا مطالبہ اس کے قوام ہونے کے خلاف اور باعث ترحم ہے۔ البتہ آپس میں ہدایا اور تحایف کا پیش کش مستحب ہے۔ لیکن سونے چاندی کے برتن یا گلاس اور مرد کے لیے سونے کی انگوٹھی کا پیش کش ناجائز ہے۔

شادی کا بنیادی مقصد جیسا کہ معلوم ہوا بقاء نسل انسانی ہے حدیث میں آیا ہے۔ "تناکحوا تناسلوا" نکاح کرو اور نسل پھیلاؤ۔ "تزوجوا الودود الولود فانی اباھی بکم الامم یوم القیامہ" شادی کرو تو خوب محبت کرنے والی اور ایسی عورت سے جس سے زیادہ اولاد ہو سکے میں تمھاری کثرت سے دوسری امتوں پر قیامت کے دن فخر کروں گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اجتماعی طور پر برتھ کنٹرول اسلامی نظریہ نہیں ہے۔ اس سے اندیشہ ہے کہ مستقبل کی بہترین نسل عدم میں ہی رہ جائے۔ خصوصاً غذائی قلت اور افلاس کے اندیشے سے برتھ کنٹرول کو اجتماعی طور پر اپنانا قدرت کے رزاق ہونے پر ہماری کم یقینی کو ظاہر کرتا ہے۔ قرآن نے فرمایا: "وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا" (ھود) زمین میں رینگنے والے جان دار تک کی روزی کا اللہ ذمہ دار ہے۔ اور یہ بھی حکم دیا گیا کہ "لا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق نحن نرزقکم وایاھم ان قتلھم کان خطاً کبیرا" (بنی اسرائیل) تم اپنی اولاد کو تنگدستی کے اندیشے سے قتل مت کرو۔ ہم تمھیں اور ان کو رزق دیں گے۔ ان کو قتل کرنا بلاشبہ ایک بڑی غلطی ہے۔ اس اعتبار سے علمائے مصر کی جانب سے لوپ کے اجتماعی جواز کا فتویٰ یقیناً خلاف ادلہ اور روح شریعت مطہرہ کے منافی ہے۔

نکاح کے اس مقدس معاملہ اور غیر موقتی معاہدہ کو پورا کرنا، فقر و غنا ہر حال میں اس کو نبھانا اور ایک دوسرے پر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو پورا کرنا نہایت ضروری ہے۔ مرد کو چاہیے کہ وہ عورت کے ساتھ حسن خلق اور سنجیدہ ظرافت سے پیش آئے۔ کھانا، لباس اور مکان کا مناسب بندوبست کرے۔ حلال کھلائے۔ تعلیم دے لیکن سختی اور ناانصافی نہ کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اکمل المومنین ایمانا احسنھم خلقا والطفھم باھلہ"۔

تم میں کامل ایمان والا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھے اخلاق اور نہایت مہربانی سے پیش آئے۔
عورت کو یہ چاہئے کہ ہر حال میں اپنی عصمت، شوہر کے مال کی حفاظت کرے اور ہر جائز کام میں شوہر کی اطاعت کرے اور اس کے منشاء کو پورا کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
" اذا صلت المرءة خمسها و صامت شہرھا و حفظت فرجھا و اطاعت زوجھا دخلت جنۃ ربھا " جب عورت پانچوں نماز پڑھے گی، رمضان کے روزے رکھے گی۔ اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرے گی اور اپنے شوہر کی اطاعت کرے گی تو وہ اپنے رب کی جنت میں داخل ہوجائے گی۔

سُلطانُ الاولیاءؑ

حضرت سید شاہ عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ کی اپنے صاحبزادہ شیخ عبد الوہابؒ کو بوقتِ رحلت نصیحت

عَلَيْكَ بِتَقْوَى اللهِ ـ	تم پر لازم ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو۔
وَلَا تَخَفْ اَحَدًا سِوَى اللهِ ـ	اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرو۔
وَلَا تَرْجُ اَحَدًا سِوَى اللهِ ـ	اور اللہ کے سوا کسی سے امید نہ رکھو۔
وَوَكِّلِ الْحَوَائِجَ اِلَى اللهِ ـ	اور اپنی سب حاجتیں اللہ کو سونپ دو۔
وَلَا تَعْتَمِدْ اِلَّا عَلَيْهِ ـ	اور اللہ کے سوا کسی پر اعتماد نہ کرو۔
وَاطْلُبْهَا جَمِيْعًا مِنْهُ ـ	تمام مرادیں اُسی سے مانگو۔
وَلَا تَثِقْ بِاَحَدٍ غَيْرِ اللهِ ـ	اور اللہ کے سوا کسی پر بھروسہ نہ کرو۔
اَلتَّوْحِيْدَ اَلتَّوْحِيْدَ ـ	توحید کو لازم پکڑے رہو۔ توحید کو لازم پکڑے رہو۔
عَلَيْهِ اِجْمَاعُ الْكُلِّ ـ	اسی پر سب کا اتفاق ہے۔

اسلام میں پردہ

مولوی حافظ سید محبوب حسین صاحب
استاذ جامعہ نظامیہ

پردہ ایک امر فطری اور حیا کا تقاضا ہے۔ نوع انسانی کی ابتدا سے آج تک ہر دور میں انسان خواہ مرد ہو یا عورت اپنے بعض اعضاء کو ڈھانکنا ہر حال ضروری سمجھتا رہا ہے اور ان کو ظاہر کرنا ناپسندیدہ ہے۔ زمانہ قدیم کی جنگلی اور وحشی قوموں نے بھی پتوں سے اپنے جسم کو چھپایا ہے۔ بالخصوص عورت کے لیے اس کی مختلف تخلیقی نزاکتوں اور خدا آگاہانہ ذمہ داریوں کے پیش نظر پردہ کی زیادہ ضرورت محسوس کی گئی ہے ان تمام نظامہائے حیات میں جو اخلاقی اقدار پر مبنی تھے پردے کے تعلق سے ضروری ہدایات پائی جاتی ہیں۔ البتہ جس نظام زندگی میں اخلاقی قدروں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے پردہ کو بھی غیر ضروری قرار دیا گیا اور بے حیائی و بدکاری کو فروغ دیا گیا۔ چنانچہ موجودہ مغربی تہذیب و معاشرت میں جس کی بنیاد جنسی انارکی اور شہوانی جذبات کی تکمیل ہے مرد و عورت کے آزادانہ میل جول کو جائز رکھا گیا اور عورت کو اس کی فطری صلاحیتیں پیش نظر رکھے بغیر اپنے سفلی جذبات کی تکمیل کے لیے ریلوں اور دفتروں وغیرہ میں مزدور و کلرک بنایا گیا۔ آزادی کے نام سے اس کو بے پردہ کیا گیا۔ تعلیم اور دنیوی ترقی کے خاطر سب کچھ روا رکھا گیا اور منڈی و بازار میں برہنہ یا نیم برہنہ کر کے چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور کہا یہ جاتا ہے کہ پردہ عورت کے لیے قید ہے، سوشیل ربط و ضبط، معاشرتی میل جول اور پر کیف زندگی کے لیے پردہ ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ آج تو دنیا کی اکثر قوموں نے مغربی طرز معاشرت کو اپنا لیا اور خود مسلمانوں نے بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر اس کو اختیار کر لیا ہے۔ یہی نہیں اب تو دیندار گھرانوں سے بھی پردہ ختم ہوتے جارہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فواحش کی کثرت ہو گئی۔ معیار اخلاق گر گیا اور عورت ایک تفریحی چیز بن کر رہ گئی کہ وہ کلب اور پارکوں میں، رقص و سرود کے محفلوں اور تھیٹروں میں عریاں و نیم عریاں ہو کر اپنے اور مرد کے جنسی جذبات کی تکمیل کا سامان کرتی ہے۔ ماسوا اس کے آج کا نوجوان اپنے اور اپنی رفیقۂ حیات کے حسن و جمال کا مظاہرہ چاہتا ہے۔ غرض کہ اب عصمت و عفت ایک بے معنی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ چنانچہ ناجائز اولاد کی کثرت ہونے لگی ہے۔ مذہب پرستوں کی جانب سے بدنامی سے بچنے کے لیے ان کو ندی، نالوں اور کچرے کی کنڈیوں میں پھینکا جانے لگا۔ جنسی خواہش کے مقابلے میں انسانی جانیں بے قدر و قیمت ہو گئی ہیں۔ اور جب حکومتوں نے اس بے حیائی کی سرپرستی شروع کی تو دوائیں اور انجکشن تیار کئے گئے اور اب "لوپ" کو رواج دیا جارہا ہے اور یہ سب کچھ خاندانی منصوبہ بندی کے حسین عنوان سے کیا جارہا ہے جو محض عیش کوشی اور لذتیت کا شاخسانہ ہے۔ مسلمانوں میں بے پردگی پھیلنے کے منجملہ اسباب کے ایک سبب ہمارے دیندار طبقہ کا مقتضیات زمانہ

سے بے خبری اور مذہبی تنگ نظری بھی ہے۔ مثلاً عورت کو تعلیم سے دُور رکھا گیا۔ ملکی حالات سے اس کو بے خبر کر دیا گیا۔ گھر سے باہر نکلنا اس کے لیے ممنوع سمجھا گیا۔ اپنے شوہر کا نام بتانا یا لینا اس کے لیے معیوب سمجھا گیا۔ کل جس تفریط سے کام لیا گیا آج اس کا ردِ عمل افراط کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔ موجودہ بے پردگی قرآنِ حکیم کے خلاف ہے تو مروجہ پردے کی موجودہ شکل بھی محلِ نظر قرار پاتی ہے۔

اسلام نے بتایا ہے کہ سارے انسان مرد و عورت درحقیقت اللہ کے بندے ہیں وہ ایک ہی آدم و حوا کی اولاد ہیں۔ آپس میں وہ کسی کے غلام نہیں۔ سماج میں دونوں مساوی ہیں البتہ ان میں تخلیقی قوتوں کا فرق ضرور ہے اسی بنا پر دونوں کا دائرہ عمل جداگانہ ہے۔ سماجی نظام کی تشکیل میں دونوں برابر کے شریک ہیں مرد تدبیر مملکت کے لیے ہے تو عورت تدبیر منزل کے لیے ہے۔

قرآن نے یہ بتایا ہے کہ کسی بھی عورت کا اصلی مقام اس کا گھر ہے "وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولیٰ۔" اپنے گھروں میں رہو اور زمانہ جاہلیت کی طرح اپنے کو دکھاتی نہ پھرو۔ اس سے ظاہر ہے کہ نمائش کے لیے بن سنور کر نکلنا اور ایک شریف زادی کے لیے جاہلیت کی روش اختیار کرنا جائز نہیں ہے — کسی کام کی تکمیل کے لیے جسم کے مختلف اعضاء ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں اور ان کا دائرہ عمل جداگانہ ہوتا ہے۔ لیکن سارے اعضاء ایک جگہ جمع ہو جائیں یا ایک قسم کا کام کرنے لگیں تو اس کا نتیجہ فسادِ عمل کی شکل میں ظاہر ہوگا اسی طرح مرد و عورت اپنے اپنے مقام پر اپنا اپنا کام انجام دیں تب ہی بہتر سماج اور صالح معاشرہ کی تشکیل ہو سکے گی البتہ کسی ضرورت کے لیے پردے میں عورت کا گھر سے باہر نکلنا ناجائز نہیں ہے لیکن وہ اپنی نظریں نیچی رکھے عصمت و عفت کی حفاظت کرے اور اپنی زینت کے مقامات کو ظاہر نہ کرے۔

عصمت و عفت عورت کا جوہر ہے۔ جس عورت کا یہ جوہر داغدار ہو جائے وہ اخلاق کی بلندی سے گر جاتی ہے۔ اسی لیے پردے کا حکم دیا گیا کیونکہ حسن و جمال کی نمائش نگاہوں کے تصادم اور نفسانی خواہشات کو ابھارنے کا سبب ہے۔ چنانچہ اسلام نے عورت کے لیے اصولی طور پر گھر میں رہنے اور ضرورت پر باہر نکلنے کی دونوں صورتوں میں پردے کے منصفانہ حدود مقرر کر دیے ہیں۔ عورت کو جب باہر نکلنا پڑے یا اجنبیوں سے سابقہ پڑنے کا اندیشہ ہو تو حکم دیا گیا کہ: "یا ایھا النبی قل لازواجک وبناتک ونساء المومنین یدنین علیھن من جلابیبھن ذالک ادنیٰ ان یعرفن فلا یوذین" (احزاب)

اے پیغمبر! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر ایک بڑی چادر اوڑھ لیں اس سے توقع ہے کہ ان کا شریف زادی ہونا واضح ہو جائے گا پس وہ ستائی نہ جائیں گی۔

گھر کے اندر رشتہ داروں، عزیزوں، ملازمین و احباب کے آنے جانے اور انفرادی و اجتماعی طور پر کھانے پینے سے منع نہیں کیا گیا۔ البتہ اخلاقی نقطہ نگاہ اس بات کا متقاضی ہے کہ بے راہ روی کو راہ نہ دینے

کے لیے چند پابندیاں لگائی جائیں تاکہ اعتدال قایم رہے۔ چنانچہ سورۂ نور میں حکم دیا گیا کہ :۔

"اے ایمان والو! جو گھر تمھارے نہ ہوں ان میں داخل نہ ہونا یہاں تک کہ تم اجازت لو اور ان کو سلام کرو یہ تمھارے لیے بہتر ہے امید کہ تم یاد رکھو گے۔ اگر تم اس میں کسی کو نہ پاؤ تو اجازت ملنے تک اس میں نہ جاؤ۔ اور اگر تم سے پلٹنے کہا جائے تو واپس ہو جاؤ یہ تمھارے لیے بہتر ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے واقف ہے۔ تم پر کوئی حرج نہیں ان گھروں میں جانے سے جس میں (عورتیں) نہ رہتی ہوں اور اس میں تمھارا اسامان ہو اللہ واقف ہے اس سے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔ مسلمان مردوں سے کہہ دو اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور شرمگاہوں کی حفاظت کریں یہ پاکیزہ طریقہ ہے ان کے لیے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ باخبر ہے۔ اور مسلمان عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کی کوئی جگہ بجز ناگزیر صورت کے ظاہر نہ کریں اور ان کو چاہیئے کہ اپنے گریبانوں پر اوڑھنیاں ڈالیں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں بجز اپنے شوہر، اپنے باپ، اپنے شوہر کے باپ یا اپنے بیٹے یا اپنے شوہر کے بیٹے یا اپنے بھائی یا بھائی کے بیٹے یا اپنی بہن کے بیٹے یا اپنی دینی عورتیں یا اپنے ملازم مرد جن کو عورت کی حاجت نہ ہو یا وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ چیزوں سے واقف نہ ہو۔ اور وہ (عورتیں) اپنے پیروں کو نہ پٹخیں کہ ان کی پوشیدہ زینت ظاہر ہو جائے۔ اے مسلمانو سب کے سب اللہ کی جناب میں توبہ کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔"

"لیس علی الاعمیٰ حرج و علی الاعرج حرج ولا علی المریض حرج ولا علی انفسکم ان تاکلوا من بیوتکم۔ الخ۔" "اندھے اور لنگڑے اور نہ مریض پر کوئی حرج اور نہ تم پر کہ تم کھاؤ اپنے گھروں میں یا اپنے ماں باپ یا بھائی اور بہنوں کے گھروں میں یا اپنے چچا یا پھوپھیوں کے گھروں میں یا ان کے گھروں میں جن کی کنجیوں کے تم مالک ہو یا اپنے دوست کے گھر میں۔ مل کر کھاؤ یا علیحدہ کھاؤ کوئی حرج نہیں۔ اور جب تم گھروں میں داخل ہو تو سلام کرو اپنے نفسوں پر اللہ کی طرف سے برکت والی اور پاکیزہ دعا کے طور پر۔ اللہ اسی طرح اپنے احکام بیان کرتا ہے تاکہ تم سمجھو۔"

ان آیات سے ظاہر ہے کہ اسلام معاشرتی زندگی کی باہمی دلچسپیوں اور تقاضوں کو ختم کرنا نہیں چاہتا۔ البتہ یہ ہے کہ بغیر اجازت گھر میں نہ جائیں۔ مرد اور عورتیں نگاہیں نیچی رکھیں اور شرمگاہ کے بارے میں پوری پوری احتیاط رکھیں اور عورتیں ہر وقت اوڑھنیوں سے سینے کو چھپائے رکھیں۔ چلتے پھرتے میں زور سے پیر نہ پٹخیں کہ پازیب وغیرہ کی جھنکار سنائی دے۔

بوڑھی عورتوں کے تعلق سے جو نکاح کی امید نہیں رکھتیں گھر میں تھوڑے کپڑوں میں رہیں تو بھی حرج نہیں بشرطیکہ بناؤ سنگھار نہ ہو۔ اور اگر پورا پردہ کریں تو یہ بہتر ہے۔

نابالغ بچے یا غلاموں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ :۔

"اے ایمان والو تم سے اجازت لیں وہ جو تمہارے غلام ہیں اور وہ جو بلوغ کو نہیں پہنچے تین اوقات میں۔ نمازِ فجر سے پہلے اور دوپہر میں جبکہ تم کپڑے اتارتے ہو اور عشاء کے بعد یہ تین اوقات تمہارے پردہ کے ہیں۔ اور ان اوقات کے بعد تم پر اور ان پر کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ تم میں آنے جانے والے ہیں۔ اللہ اپنے احکام تمہارے لیے اسی طرح بیان کرتا ہے اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ اور بچے جب بالغ ہو جائیں تو ان کو اجازت لینا چاہیے جس طریقے پر کہ ان سے پہلے والوں نے اجازت لی ہے۔ اللہ اپنے احکام ایسا ہی تمہارے لیے بیان کرتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔"

سورۂ نور کے مذکورہ آیات گھر کے اندر پردے کے بارے میں ہیں اور سورۂ احزاب کی آیتیں باہر نکلنے سے متعلق ہیں۔ احادیث نبویہ سے مزید یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض خاص صورتوں میں رعایتیں دی گئی ہیں مثلاً نکاح کی غرض سے مرد، عورت ایک نظر آپس میں دیکھ سکتے ہیں۔ جج مطلوبہ شناخت کے لیے اور طبیب تشخیص امراض کے لیے نیز حالتِ جنگ اور حالتِ سفر وغیرہ میں بھی رعایت رکھی گئی ہے جن کی تفصیل کتبِ فقہ میں موجود ہے اور فقہ کا مسلمہ ہے۔ "الضرورات تبیح المحذورات" بوقت ضرورت ممنوعات بقدر ضرورت مباح ہو جاتے ہیں۔

برادرانِ اسلام! صالح معاشرہ کے قیام اور عورت کی آزادی و عصمت کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ افراط و تفریط کو چھوڑ دیں اور اسلام نے مرد و عورت کے ربط و ضبط کے لیے جو حدود مقرر کئے ہیں اس کی پوری پوری پابندی کی جائے۔ اگر ہم حدودِ اعتدال سے ہٹ جائیں تو مغربی تہذیب کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہنا ہمارے لیے مشکل ہو جائے گا۔

مومن کی پہچان:

دوسروں کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرے۔

ان اصولوں سے محبت جنھیں اس نے برحق اور انسانیت کے لیے رحمت سمجھا ہے۔

اپنے ان تمام بھائیوں سے ہمدردی جو زندگی کے صحیح اصولوں سے محروم ہیں اور مسلسل بربادی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

منافق کی پہچان:

بات کرے تو جھوٹ بولے وعدہ کرے تو پورا نہ کرے امین بنایا جائے تو خیانت کرے عیب گوئی سے

جھگڑا کرے تو بد کلامی کرے اور گالی گلوچ پر اتر آئے

اس آئینہ میں ہر شخص اپنا چہرہ دیکھے اس میں سے جو بات دکھائی دے اس کو دور کرنے کی کوشش کرے۔

مولوی قاری محمد انصار علی صاحب قریشی
استاذ جامعہ نظامیہ

ترقی کیا ہے - ؟!

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ انسان فطرتاً جدت پسند واقع ہوا ہے۔ تجدد و تنوع کی طرف رغبت و میلان اسکا جبلی خاصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ روزِ اول سے اسی میں غلطاں و پیچاں نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال فرماتے ہیں:-

طرح نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

اس جدت پسندی کی خواہش نے انسان کو نت نئے ایجادات و محیر العقول انکشافات کی جانب راغب کیا ہے اور حیرت خانۂ امروز و فردا کی تڑپ ہی نے اسے نئی دنیا کی تلاش و جستجو پر ابھارا ہے۔ کبھی وہ ستاروں پر کمندیں پھینکتا نظر آتا ہے تو کبھی سمندروں کو کھنگالتا دکھائی دیتا ہے اور کبھی وہ تیز رفتار راکٹوں کے ذریعے چاند و مریخ تک رسائی حاصل کرنا اور وہاں اپنی بستی بسانا چاہتا ہے تو کبھی برق رفتار سواریوں کے ذریعے دنوں کا فاصلہ منٹوں میں طے کرتا ہے۔

تاریخ تمدن کے اس لمبے ارتقائی زمانہ کو چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک وہ ابتدائی دور جس میں آدمی پتھر کے اوزاروں سے کام لیا کرتا تھا۔ دوسرا وہ دور جس میں لوہے کی دریافت ہوگئی تھی اور اس سے آدمی اوزار و ہتیار بنانے لگا تھا۔ تیسرا بجلی کا دور جو یورپ میں صنعتی انقلاب سے شروع ہوتا ہے۔ چوتھا ایٹمی دور جس میں ہم داخل اور دوچار ہیں۔ بلحاظ مادی ترقی یہ آخری دور پچھلے تمام دوروں سے زیادہ ترقی یافتہ اور ماڈرن سمجھا جاتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ حقیقی ترقی اور اس کا اصل معیار کیا ہے؟! فقط مادی ترقی ہی سب کچھ ہے یا پھر اس کے ساتھ اور اس سے کہیں زیادہ اہمیت کی حامل اخلاقی و روحانی ترقی ہے۔ کسی قوم یا ملک کی ترقی اور اس کے دائرہ عمل کا جب کبھی جائزہ لیا جاتا ہے تو اس میں مذہب و اخلاق، تہذیب و تمدن اور انسانیت و روحانیت کو بنیادی اہمیت حاصل رہتی ہے اور مادی ترقی کا درجہ ثانوی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ ان دونوں کے بغیر کامل و مکمل ترقی متصور نہیں ہوتی۔

بلاشبہ انسان نے آج علوم و فنون اور سائنس اور اس کے مختلف شعبہ جات میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کی ہیں اور سائنس کے ذریعے بڑے بڑے کام ہونے لگے ہیں لیکن باوصف اس کے آج سارے عالم کو اس سے ایک بڑے نقصان اور عظیم تباہی کا اندیشہ لگا ہوا ہے۔ تصادم و کشمکش نے انسانی زندگی میں خوف و دہشت پیدا کر دیا ہے اور آج انسانیت امن و سلامتی کی پیاسی نظر آرہی ہے۔ جب ہم آج کی اس ترقی اور درپیش حالات و مسائل کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے ہیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ دنیا میں ظلم و برائیاں پہلے چھوٹے پیمانے پر ہوتی تھیں تو وہ اب بڑے پیمانہ پر اور ترقی یافتہ شکل میں ہونے لگی ہیں۔ پہلے لڑائیاں ہوتی تھیں تو آدمی لوہے

اور پتھر کے ٹکڑوں سے لڑتا تھا اور آج جوہری اسلحہ دنیا کو خیز و قیامت بپا بموں، شعلہ زن راکٹوں اور زہریلی گیسوں کے ذریعے دُنیا کے ایک بڑے حصہ کو بھون ڈالتا اور اس کی پوری آبادی کو تہس نہس کر دیتا ہے۔ پہلے بُرائی زبان سے پھیلتی تھی اور معاشرہ میں بگاڑ پیدا کرتی تھی اور آج سینما، ریڈیو اور پریس کے ذریعے ساری دُنیا اور سوسائٹی کو بگاڑا جا رہا ہے۔ پہلے چند ڈاکو مل کر کچھ بستیوں کو لوٹتے تھے اور آج صنعتی انقلاب اور جدید بنکنگ سسٹم نے ایسے مواقع فراہم کر لیے ہیں کہ چند ذہین اور شاطر نفوس مل کر پورے معاشرے و سماج کو شریف و سائنٹفک طریقے سے بہ آسانی لوٹ سکتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں چنگیز اور ہلاکو صرف خشکی کے علاقوں پر فساد بپا کر سکتے تھے اور آج فسادی اُٹھتا ہے تو وہ خشکی تو خشکی، سمندروں اور خلاؤں و فضاؤں میں تک اپنی تباہ کن فوجی طاقتوں کو پھیلا دیتا ہے اور جارحیت آج اپنی بے پناہ وسعتوں کے ساتھ عالم انسانی کی فضائے بسیط پر احاطہ کرتے جا رہی ہے "اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی" کی مثل صادق آ رہی ہے۔ غرض کہ وہ مادی ترقیوں کا جہاں افادی اور روشن پہلو ہے وہیں ان کا تاریک و بھیانک رُخ بھی ہے۔ اتنی بات تو صاف ہے کہ علم و ایجاد کوئی فعل عبث نہیں ہے وہ تو بجائے خود مفید، مطلوب و محبوب ہے۔ کسی چیز کے حُسن و قبح کی اصل بُنیاد اس کے استعمال کے اچھے اور بُرے ہونے پر ہے۔ جہاں استعمال دُرست ہو غرض نیک ہو، تو وہ موجب رحمت ہے اور جہاں استعمال ہی درست نہ ہو اور غرض فاسد ہو تو وہ سراسر موجب زحمت ہے۔ یہاں اس نقطہ پر پہنچ کر انسان کو مذہب ہی کی تلاش اور اس کی ضرورت پیش آتی ہے اور ایک مکمل ضابطہ حیات کی ضرورت، ناگزیر شکل میں اس کے سامنے آتی ہے اس وقت دنیا کی ساری ترقی اور انسان کا اپنا علم اور اس کی عقل رسا یہاں پہنچ کر جواب دے دیتی اور اپنی کم مایگی اور درماندگی کا ثبوت دیتی ہے۔ بالآخر مذہب و دین ہی آگے بڑھ کر ان کی صحیح ترجمانی کرتا ہے اور سب سے پہلے افراد انسانی کو "حسن عمل" کی تعلیم و تلقین کرتا ہے۔ مذہب یہ کہتا ہے کہ انسان کی موت و حیات کا مقصد تخلیق دراصل انسان کے حسن عمل کا امتحان کرنا ہے اور اس کا فرد سے یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ وہ سماج و معاشرہ میں حسن عمل، مستی کردار، نیک و بلند سیرت کا مظاہرہ کرے اپنے رفیق سفر کے لیے وہی چاہے جو خود اپنے لیے چاہتا ہے۔ جھوٹ، مکر، دھوکہ، خیانت اور ہر قسم کی بُرائی کا مرتکب نہ بنے یہاں تک کے انسانی معاشرہ محاسن و اخلاق حسنہ اور امن و سکون کا پیکر و مظہر بن جائے چنانچہ اسلام نے تمام بنی نوع انسان کو نیک بننے، کردار میں مستی پیدا کرنے کی بڑے ہی حکمت و موعظت کے ساتھ بار بار ہدایت کی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے: "والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات" الخ قسم ہے زمانہ کی کہ بے شک انسان گھاٹے میں ہے مگر مومن و صالح افراد اس گھاٹے سے مامون و مصئون ہیں۔ ایک دوسرے مقام پر قرآن بلاغت نظام کا اعلان ہے: "خلق الموت و الحیوٰۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاً"۔ یعنی اللہ تعالیٰ موت و حیات کو محض انسان کے حسن عمل کی آزمائش و امتحان کے لیے پیدا کیا ہے" انسان کو ابدی زندگی میں کام آنے والی اور اس کو اونچا اٹھانے والی چیز تو انسان کا نیک عمل ہی ہوتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: "الیہ یصعد کلم الطیب والعمل الصالح یرفعہ۔"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور ان کے مشن کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ بنی نوع انسان کو ایک کنبہ اور قوم میں شامل کر دیا جائے اور انسانی معاشرے میں مکارم اخلاق کو پھیلایا جائے چنانچہ نبی اکرم ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "بعثت لاتمم مکارم الاخلاق" یعنی مجھے مکارم اخلاق کو پورا کرنے اور انھیں پھیلانے کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔

حضور صلعم نے انسان کے اندر سب سے پہلے اس بات کا شعور پیدا کیا کہ اس کا انفرادی وجود ان صفات و خوبیوں کا حامل ہونا چاہیے جو خالق کائنات کی مرضی کے مطابق ہو۔ آپ نے یہ بھی تعلیم دی کہ ہر انسان کو اس بات کا انتظار کئے بغیر کہ دوسرے افراد بھی ان خوبیوں کا مظاہرہ کریں خود اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا چاہیے اور ان پابندیوں کو عملاً قبول کرنا چاہیے جو ان پر عاید کئے گئے ہیں اور ان تمام خوبیوں اور اچھائیوں کو بھی اپنانا چاہیے جو معاشرے کے لیے مفید و نفع بخش ہیں اور جن سے زمانے کے جائز تقاضے بھی پورے ہو سکتے ہیں چنانچہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا بڑا حکیمانہ ارشاد ہے: "الحکمۃ ضالۃ المؤمن فہو احق بہا حیث وجدہا" یعنی حکمت اور اچھائی دراصل مومن کی گم شدہ پونجی ہے۔ مومن ہی اس کا زیادہ مستحق ہے کہ وہ اس کو جہاں بھی پائے حاصل کر لے۔ غرض کہ دنیا کی تعمیر و ترقی میں حسب قانون الٰہی حصہ لے کر انسان اپنا فرض انجام دیں گے تو ان کی دنیاوی ترقی بھی عبادات و صدقات کی طرح نجات اُخروی کا ذریعہ و وسیلہ ثابت ہوگی۔

لیکن موجودہ صورت حال ایسی [illegible] ہے مادیت اور روحانیت کا توازن بگڑ گیا ہے اور مادیت روحانیت پر غالب آچکی ہے۔ انسان روح و جسم کا مرکب ہے اگر روح و جسم کا قدرتی توازن بگڑ جائے تو نظام صحت درہم برہم ہو جاتا ہے۔ یہی حال کل کائنات اور سارے انسانی سماج کا ہے۔ آج کے سماج کی ایک دوسری خرابی یہ ہے کہ "لامذہبیت" کو ترقی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اس لیے تعلیم بھی ایسی ہی قابل فخر ہے جو صرف لادینی اور سیکولر بنیادوں پر قائم ہو۔ اگر نظام تعلیم میں صرف مادیت ہی مادیت ہو روحانی اقدار، اخلاقی کردار کی کوئی گنجائش نہ ہو تو ان کے نتائج مطابق توقع نہ ہوں گے۔ قرآن کریم کا یوں ارشاد [illegible] خدائے ذوالجلال اور دین و مذہب پر یقین رکھنے والے ایک طرف "فی الدنیا حسنۃ" کی راہ پر گامزن ہوں تو دوسرے طرف "فی الآخرۃ حسنۃ" کو بنیاد ستور العمل بنائیں مطلب یہ کہ ایک فرد مومن کو دین و دنیا کا جامع ہونا چاہیے۔

آج اسلامی تعلیمات سے تغافل ہی [illegible] گیا بلکہ اس سے ہم میں بغض بھی پیدا ہو گیا اسی وجہ سے ہم سیاسی و معاشی غلامی کے ساتھ اب ذہنی غلامی کا شکار ہو گئے ہیں جس کے نتیجے میں عقل و ادراک کے لحاظ سے ہم مغربی دنیا سے نہ صرف متاثر ہو گئے بلکہ ہماری روح صحیح القوام خودداری کے عنصر سے بھی خالی ہو گئی۔

غرض تعلیم کے بدل جانے سے افکار بھی بدل گئے، علم جو پہلے کمال نفس کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اب ذریعہ معاش ہو گیا ہے یونیورسٹیاں جن کو ایک مبصر نے حکومت کے ذاتی مفاد کے قلعے کہا ہے ملازم پیشہ افراد پیدا کرنے کی مشینیں ہو گئیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم جو امراض قومی و ملکی کی دوا سمجھی گئی تھی، افسوس وہ دوا ثابت نہ ہو سکی بلکہ ہماری ذہنیت کو بدل کر ہمیں

مشرقی رکھی نہ مغربی۔

ایسی صورت میں ملت کے نونہال و نوجوان افراد میں دینی تعلیم کو اعلیٰ پیمانے پر رائج کرنے کی آج اشد ضرورت ہے کہ انھیں آگے چل کر نفع بخش طریقہ پر اعلیٰ دنیاوی تعلیم حاصل کرنی ہے، دینی تعلیم کو صرف نظر کر کے مسلم بچوں نے اعلیٰ دنیاوی تعلیم حاصل کر لی تو ان کے لیے دہریت یا عیسائیت وغیرہ کی آغوش کھلی ہوتی ہے، یہی وجہ تھی کہ حضور اکرم رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات میں اس بات کی وضاحت فرما دی کہ خدا ترسی، اعمال کی مسئولیت اور جوابدہی کے بغیر انسانی معاشرہ زندگی کی گمراہیوں سے کبھی اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا کیونکہ اسی خدا ترسی سے اخلاق کی سوتیں ابلتی ہیں اور انھیں سے انسانیت کی کھیتی سیراب ہوتی ہے۔

اسلام میں معاد و معاش کے مسائل دو متوازی خطوط پر چلتے ہیں ۔ مادیت میں اگر حلال و حرام، جائز و ناجائز، طیب اور خبیث کی تمیز رہے تو مادیت بھی روحانیت کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے جس کی وجہ سے دین و دنیا کا فرق مٹ جاتا ہے اگر خلائے بسیط کا سفر اس لیے ہو کہ اس سے انسانی قدروں کو فروغ ملے اور نئی نئی ایجادات کو انسانی خدمت میں لگایا جائے تو یہ عین مذہب و روحانیت بن جاتی ہے اور اسلامی اصطلاح میں اس پر عبادت کا اطلاق ہونے لگتا ہے کیونکہ اس راز کا انکشاف اسلام ہی نے کیا تھا کہ مادی وسائل کو انسانی خدمت میں وقف کر دینا اور یہ سمجھنا کہ مذہب ہی نے یہ راہ دکھائی ہے عین روحانیت و دین ہے، اس طرح خیالات کا نٹا بدلتے ہی دنیا دین کا جامہ پہن لیتی ہے، اور جو مادی وسائل خدائے تعالیٰ سے غافل کرنے کا موجب ہوں وہ روحانیت کے حریف ہیں اور جن وسائل سے مخفی ہستی مستحضر رہے وہ دین بھی ہے اور دنیا بھی۔

روس نے ابتدائی تحقیقات کے دوران اپنے خلاباز کو صرف سو میل کی بلندی پر بھیجا تھا مگر چونکہ کمیونزم کی بنیاد سراسر مادیت پر قائم ہے اس لیے اس کے سابق وزیر اعظم کی رگ دہریت پھڑک اٹھی لہذا اس نے انتہائی گستاخی سے کہا تھا کہ خلائی مسافر کو خدا اوپر بھی نظر نہ آیا اور نہ اسے جنت و دوزخ کا نشان ہی مل سکا، یہ تھی خالص مادیت اور بے روحانیت کی دین کہ خالق کائنات کی لامحدود دنیا میں سفر کیا جائے اور اسی خالق کا نعوذ باللہ مذاق اڑایا جائے "یضل بہ کثیرا و یھدی بہ کثیرا" یعنی اس کائنات کی تنظیم اور ترتیب سے ایک انسان مرتب اور منتظم کو شناخت کر کے ہدایت کی راہ پاتا ہے اور اسی کائنات کی وسعتوں سے دوسرا انسان اس کے انکار کی راہ نکال کر گمراہ ہو جاتا ہے۔

بہر حال اخلاقی قدروں سے مادی و سائنس و صنعت کا انقلاب انسان کو ترقی و خوش حالی کی طرف لے جانے کے بجائے حرام، افلاس، بے کاری اور جنگ کی طرف لے جا رہا ہے اور اس کی مثالوں میں اضافہ کا سبب بن گیا ہے، اس پر طرہ یہ کہ اس نے اپنے مالک حقیقی کو نظر انداز کر کے زندگی کے سفر کے لیے لوہے اور فولاد کی گاڑیاں تو تیار کر لیا مگر ان گاڑیوں کو اس راستے پر چلانا نہیں سیکھا جو خدائے تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر کیا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی سرگرمیوں کا رخ نہ صرف غلط راہوں کی طرف ہو گیا بلکہ وہ زندگی کے بجائے موت و ہلاکت کی جانب سفر کرنے لگا۔ خلاصہ یہ کہ "آج کا انسان آسمانوں پر اڑنا تو سیکھ گیا مگر انسان بن کر جینا نہ سیکھ سکا۔"

عطا اسلاف کا جذبہ دروں کر | شریک زمرۂ لایحزنوا کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں | مرے مولیٰ مجھے صاحب جنوں کر

اِجتہاد

مولوی خلیل احمد صاحب
متعلم کامل الفقہ سالِ اوّل

الحمد للہ الذی علم القرآن خلق الانسان وعلمہ البیان ورفع درجۃ العالمین بمعانی کتابہ وخص المستنبطین منھم بمزید الاصابۃ وثوابہ۔ والصلاۃ والسلام علی النبی الخاتم وعلی آلہ وصحبہ اجمعین۔

اسلام دینِ فطرت اور ایک مکمل ضابطۂ زندگی ہے جس میں تمام مصالح انسانی اور اس کے تقاضوں کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اسلام کے جملہ احکام و تعلیمات کے اصل ماخذ کل چار ہیں۔ ہر معاملہ اور عمل میں انہی چار اصولوں کی طرف رجوع کیا جاتا اور ہر مسئلہ میں انہی کو بطور حجت و دلیل کے پیش کیا جاتا ہے۔ ان بُنیادی اصول کو علم اصول فقہ میں "ادلۂ اربعہ شرعیہ" یا "اصول شرع" کہا جاتا ہے۔ شریعت غرّہ کی بُنیاد انہی چار اصولوں پر قایم کی گئی ہے۔

۱۔ **کتاب اللہ:** (قرآن مجید) وہ کتاب مقدس جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی اور بلا کسی تحریف و تبدیلی کے صحت ترتیب کے ساتھ محفوظ ہے اور احکام، قصص، امثال و عبر پر مشتمل ہے اور بنی نوع انسان کے لیے سرچشمۂ ہدایت ہے۔

۲۔ **سُنّتِ رسول اللہ:** نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احادیث و اخبار قولی ہوں کہ فعلی تقریری ہوں یا سکوتی سب کے سب حجت شرعی ہیں۔

۳۔ **اجماعِ امت:** کسی امر حادث میں صحابہ، تابعین و سلف کا اتفاق۔ یہاں اجماع امت سے مُراد اہل الرائے و اہل اجتہاد و استنباط کا اتفاق ہے۔ عوام الناس کا اتفاق مراد نہیں۔ عوام الناس کے کسی مسئلہ میں اتفاق کر لینے کو شرعاً اجماعِ امت نہیں کہا جاتا۔

۴۔ **قیاس:** یہاں قیاس سے قیاس شرعی مُراد ہے قیاس منطقی و عقلی مفہوم نہیں ہے۔ ایسے امور، حوادث و نوازل کہ جن کے متعلق قرآن، حدیث اور اجماع امت ساکت ہوں اور ان کی حلت و حرمت، اباحت و عدم اباحت کا کوئی قطعی حکم نکلنے میں ان اصول سے رہنمائی نہیں مل رہی ہو تو مجتہد وقت اپنے تبحرِ علمی اور تفقہ دینی سے انہی ادلہ اور ان سے مستنبطہ مسائل و مشترک علت کی روشنی میں درپیش مسئلہ میں قیاس و اجتہاد کرتا ہے تاکہ عمل کرنے میں سہولت ہو۔

ثبوتِ اجتہاد | عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اجتہاد کی ابتدا ائمہ اربعہ سے ہوئی اور اس کا اختتام بھی انھیں پر ہوا۔ مگر حقیقت ایسی نہیں ہے۔ عہد رسالت و صحابہؓ سے ہی اجتہاد کا

وجود چلا آرہا ہے۔ انبیاء سابقین سے بھی بعض مسائل میں اجتہاد کرنا ثابت ہے۔ احادیث و آثار سے بھی اجتہاد کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبلؓ والی مشہور حدیث کو لیجئے کہ "آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو یمن کا والی و حاکم بنا کر بھیجا۔ روانگی سے پہلے آپ نے معاذؓ سے دریافت کیا: اے معاذ! پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم مقدمات کا فیصلہ کیسے کروگے؟ عرض کیا یا رسول اللہ! کتاب اللہ سے فیصلے کروں گا۔ فرمایا: اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ گے تو کیا کروگے؟ عرض کیا سنت رسول اللہ سے کروں گا۔ پھر فرمایا کہ اگر تمھیں میرے عمل سے بھی نظیر نہ ملے تو کیا کروگے؟ تو حضرت معاذؓ نے عرض کیا: میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذؓ کے اس جواب کو درست و صواب قرار دیا اور اس پر خوشنودی کا اظہار فرمایا اور پھر درگاہ ایزدی میں ہدیۂ تشکر بھی پیش فرمایا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کے رسولؓ کو ہدایت دی" خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قیاس و اجتہاد فرمایا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ ایک صحابیہؓ کے والد بزرگوار کا انتقال ہوگیا۔ ان پر حج فرض تھا۔ صحابیہ نے خدمتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ "میرے والدِ محترم کا انتقال ہوگیا ہے اور ان پر حج فرض تھا۔ کیا اس کی قضا ضروری ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تمھارے والد پر قرض ہوتا تو کیا تم اسے ادا نہ کرتی؟ عرض کیا کیوں نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ حج کی قضا بھی ایسے ہی ضروری ہے جیسے قرض کی ادائی۔ اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضور صلعم نے وجوب حج کو وجوب ادائے دین پر قیاس فرمایا۔ مجتہد بھی اسی طرح قیاس کے ذریعہ نامعلوم حکم کو معلوم کرتا ہے۔

اسی طرح انبیائے سابقین میں حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیہما السلام کے زمانے میں ایک واقعہ پیش آیا۔ ایک شخص کی بکریاں کسی کا کھیت چر گئیں۔ اس مسئلہ کو دونوں پیغمبروں کے پاس پیش کیا گیا دونوں نے اپنے اپنے اجتہاد سے علٰحدہ علٰحدہ فیصلہ دیا اگر ان کے فیصلے اجتہادی نہ ہوتے بلکہ وحی کے ذریعے ہوتے تو اختلاف نہ ہوتا۔ قرآن میں بھی ہم تفکر و تلاش کریں تو معلوم ہوگا کہ قرآن نہ صرف اجتہاد و تفکر کی اجازت دیتا ہے بلکہ اس کا حکم دیتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "فاعتبروا یا اولی الابصار"۔ عبرت کے اصل معنی "رد الشیئ الی نظیرہ" کے آتے ہیں۔ قرآن کریم امم سابقہ کی ہلاکت اور عذاب میں مبتلا ہونے کے بعد فاعتبروا یا اولی الالباب کا حکم دے رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن اسباب و علل کی بنا پر سابقہ قومیں تباہ و برباد ہوگئیں موجودہ اور آنے والی قوموں کی بھی تباہی و بربادی کو انہی اسباب و علل پر قیاس کرلو۔ ان سب کی ہلاکت میں علت مشترکہ خدا کی نافرمانی ہے۔ مجتہد بھی اپنے قیاس میں اصل مقیس علیہ کا حکم فرع مقیس کو علت مشترکہ کی وجہ سے دیتا ہے۔

تعریف اجتہاد اجتہاد کے لغوی معنی کوشش و جد و جہد کے ہیں۔ اصطلاح میں بموجب محب اللہ بہاری صاحب مسلم الثبوت "الاجتہاد بذل الطاقۃ من الفقیہ فی تحصیل

امر شرعی ظنی"۔ یعنی فقیہ کا کسی حکم شرعی ظنی کے حاصل کرنے میں طاقت کا صرف کرنا۔ مطلب یہ کہ مجتہد نامعلوم حکم کے معلوم کرنے کے لیے جو جد و جہد کرتا ہے اسی کا نام "اجتہاد" ہے۔ اصول کی اصطلاح میں فقیہ اور مجتہد ہم معنی الفاظ ہیں۔ آج کل عوام میں فقیہ کا لفظ جن معنی میں استعمال ہوتا ہے اس کے لیے اصولیین "عالم بالمسائل" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ تعریف میں چند قیود احترازی ہیں۔ اس میں فقیہ کی قید اس لیے لگائی گئی کہ غیر فقیہ کی صَرفِ محنت کو اصطلاح میں اجتہاد نہیں کہتے۔ حکم شرعی کی قید اس لیے لگائی گئی ہے کہ عملیات میں جو قوت صرف کی جاتی ہے وہ خارج ہو جائے کیونکہ اسے بھی اصطلاحاً اجتہاد نہیں کہتے۔ ظنی کی قید اس لیے اضافہ کی گئی ہے کہ اجتہاد مسائل قطعیہ میں نہیں ہو سکتا۔

شرائطِ اجتہاد

یہ بات تو واضح ہو چکی کہ اجتہاد کرنا ہر کسی کا منصب نہیں۔ اس کی ایک مخصوص و مختص جماعت ہوتی ہے جسے ہم "طبقہ مجتہدین" کہتے ہیں۔ اس طبقہ کو اجتہاد کا حق حاصل ہے۔ مجتہد بننے اور اجتہاد کرنے کے لیے چند شرائط ہیں۔ صدر الشریعہ نے باتباع فخر الاسلام لکھا ہے کہ مجتہد کے لیے قرآن کے لغوی و اصطلاحی معنوں اور اس کے مختلف اقسام، اسی طرح حدیث کے متون و اسناد، اس کے اقسام اور قواعد قیاس سے واقف ہونا ضروری ہے۔

صاحب جمع الجوامع نے مستقل مجتہد کے لیے حسب ذیل شرائط کو ضروری قرار دیا ہے:-
مجتہد عاقل و بالغ ہو، عربی زبان پر اوسط درجہ کا عبور رکھتا ہو، صنائع بدائع سے اچھی طرح واقف ہو، قرآن مجید میں ناسخ و منسوخ، شانِ نزول اور علوم قرآن سے بھی واقف ہو۔ اسی طرح اقسام حدیث اور ان کے قواعد و ضوابط، اسماء رجال سے واقف ہو اور قوی و ضعیف حدیث میں امتیاز کرنا بھی ضروری ہے۔ اجتہاد کے لیے اتقاء کی شرط نہیں ہے تاہم اتقاء کو اہمیت ضرور دی گئی ہے۔ صاحب مسلم الثبوت محب اللہ بہاری نے اسلام کی شرط لگائی ہے یہ ایک ضروری شرط ہے اس لیے کہ حاکم کو جانے اور مانے بغیر حکم کرنا اصلاً صحیح نہیں ہو سکتا۔ مسلم غیر متقی کا اجتہاد صحیح تو کہلائے گا لیکن بہ سبب عدم تقوی قابل توقف ہوگا۔ عورت اور غلام بھی مجتہد ہو سکتے ہیں۔ مخفی مباد کہ مجتہد کے لیے قرآن مجید کے اس قدر حصہ کا علم ضرور ہے جس قدر قرآن کا حصہ احکام سے متعلق ہے وہ صرف (۵۰۰) آیات ہیں اسی طرح حدیث کا بھی اس قدر حصہ جاننا ضروری ہے جس قدر حصہ احکام سے متعلق ہے اور وہ (۳۰۰) احادیث ہیں۔ اسی طرح اجماع شدہ مسائل سے واقف ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ جس مسئلہ میں اجماع ہو چکا ہے اس میں اجتہاد کی حاجت ہے اور نہ اجازت کی۔ قرآن مجید و حدیث مختلف علوم و فنون پر مشتمل ہیں مثلاً فصاحت و بلاغت تاریخ وغیرہ ان سب سے واقف ہونا شرائط کے درجہ میں نہیں۔

اقسامِ اجتہاد

بلحاظِ حالات اجتہاد کی چند قسمیں ہیں: (۱) واجب عین (۲) واجب کفایہ (۳) مندوب (۴) حرام۔

متعلق کسی سائل نے سوال کیا ہو یا
واجب عین: یہ اجتہاد اس وقت واجب عین ہوگا جب کہ واقعہ وقوع پذیر کے
خود مجتہد اس پر عمل کرنا چاہتا ہو اور مجتہد صرف ایک ہی ہو اس مجتہد واحد پر واقعہ کا حکم معلوم کرنے کے لیے اجتہاد
فرض عین ہوگا ایسی صورت میں اجتہاد نہ کیا گیا تو وہ مجتہد گنہگار ہوگا۔
واجب کفایہ: کوئی واقعہ وقوع پذیر ہو چکا ہو اور مجتہد ایک سے زاید ہوں تو ایسی صورت میں واقعہ وقوع پذیر کا حکم
معلوم کرنا سب پر فرض ہے لیکن اگر کسی ایک مجتہد نے حکم معلوم کیا اور جواب دے دیا تو وجوب سب سے ساقط ہوگا
اور اگر کسی نے بھی نہ حکم معلوم کیا اور نہ جواب دیا تو سب مجتہد گنہگار ہوں گے۔
مندوب۔ اجتہاد اس صورت میں مندوب و مستحب ہوگا جب کہ سوال قبل از وقوع واقعہ کیا گیا ہو یا خود مجتہد
اس کا حکم کرنا چاہتا ہو۔
حرام: ایسا اجتہاد جو نص صریح کے خلاف کیا گیا ہو حرام کہلائے گا۔ حقیقت میں ایسے اجتہاد کو اجتہاد ہی نہیں
کہتے کیونکہ اجتہاد کا حکم اس صورت میں دیا گیا ہے جب کہ کسی چیز کا حکم ادلۂ شرعیہ قرآن، حدیث، اور اجماع میں
نہ ملے۔ اجتہاد کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ کسی حکم شرعی ظنی کے معلوم کرنے میں مجتہد اپنی محنت صرف کرے لہذا قرآن،
حدیث، اجماع کے خلاف کوئی اجتہاد قابل قبول ہی نہیں۔

حکمِ اجتہاد

اجتہاد سے جو حکم معلوم کیا جاتا ہے وہ قطعی نہیں ہوتا ظنی ہوتا ہے جو محتمل خطا و صواب ہوتا
ہے۔ خطا، اجتہادی بھی موجب ثواب ہے اگر کوئی مجتہد اپنے اجتہاد میں خطا کرے تو اسے ایک
ثواب ملے گا اور اس کا اجتہاد صواب پر ہو تو اسے دہرا ثواب ملے گا۔ جب کسی مسئلہ میں کئی مجتہد اجتہاد کریں اور
ہر ایک کا حکم اجتہاد دوسرے کے حکم اجتہاد سے مختلف ہو تو کسی مجتہد کو حق نہیں کہ وہ دوسرے مجتہد پر طعن و
تشنیع کرے اس لیے کہ اجتہاد میں اختلاف ممکن ہے۔ کوئی مجتہد قطعیت سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا اجتہاد حق
کے مطابق ہے کیونکہ ہر مجتہد کے اجتہاد میں خطا کا احتمال رہتا ہے البتہ تنبیہ اس صورت میں کی جا سکتی ہے جبکہ
اجتہاد خلاف اصول کیا گیا ہو، ہر مجتہد کو اپنے اجتہاد کے متعلق یہ گمان رکھنا چاہیے کہ اس کا اجتہاد برحق ہے
لیکن احتمال خطا باقی ہے دوسروں کا اجتہاد غلط ہے لیکن احتمال صواب باقی ہے اس لیے کہ حق صرف کوئی ایک
حکم ہے۔ ہر مجتہد کو اپنے ہی اجتہاد پر عمل کرنا ضروری ہے دوسروں کے اجتہاد پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ
اپنے اجتہاد کے حق ہونے سے اعراض کر رہا ہے۔ دوسروں کے اجتہاد پر اس صورت میں عمل کیا جا سکتا ہے جب کہ
خود کا اجتہاد بھی اسی کے موافق ہو حقیقت میں یہ غیر کے اجتہاد پر عمل نہیں ہے بلکہ خود ہی کے اجتہاد پر عمل کرنا ہے
مقلدین کو یہ حکم ہے کہ وہ اپنے امام کے حکم کو حق سمجھیں کسی امام کے مقلد کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسرے امام کے
مقلدین پر طعن کرے یا دوسرے ائمہ کرام کے اجتہادات میں کلام کرے اس لیے کہ علماء کی شان میں گستاخی
فسق ہے۔ تمام ائمہ کرام حق پر ہیں اور ان کے مذاہب برحق ہیں۔
تمام اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ مجتہد کا اجتہاد محتمل خطا و صواب ہے۔ معتزلہ کا اس میں اختلاف ہے۔

ان کے نزدیک ہر مجتہد مصیب ہے لہذا اجتہاد میں خطا کا احتمال نہیں ہے معتزلہ کا مسلک عقل و نقل ہر دو کے خلاف ہے نقل سے یہ بات ثابت ہے کہ اجتہاد میں احتمال خطا و صواب ہے۔ حدیث شریف میں ہے اگر مجتہد خطا کرے تو ایک ثواب اور اگر صواب پر ہے تو دوہرے ثواب کا مستحق ہوگا۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے ایک سوال کیا گیا جس پر آپ نے فرمایا کہ میں اس مسئلہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اگر صواب کو پالوں تو وہ اللہ کی طرف سے ہے اگر خطا کر جاؤں تو وہ مجھ سے اور شیطان کی طرف سے ہے۔ غرض کئی احادیث سے خطا اجتہادی کا ثبوت ملتا ہے۔

نقض اجتہاد کا کسی کو اختیار نہیں

جب کوئی اجتہاد کتاب و سنت اور اجماع کے خلاف نہیں کیا گیا ہو تو اس کے حکم کو توڑا نہیں جا سکتا۔ صاحب اشباہ والنظائر لکھتے ہیں کہ ایک اجتہاد دوسرے اجتہاد سے نہیں ٹوٹتا۔ عدم نقض کی دلیل اجماع ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے چند مسائل میں فیصلہ کیا جس میں حضرت عمرؓ نے آپ کا خلاف کیا لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ کا فیصلہ نہیں توڑا گیا۔ یہ چیز تمام صحابہ کرامؓ کے سامنے ہوئی سبھوں نے خاموشی اختیار فرمائی کسی سے بھی کوئی خلاف مذکور نہیں ہے۔ عدم نقض کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہر دو اجتہاد محتمل خطا ہیں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا ترجیح بلا مرجح ہے۔ اگر اجتہادِ اول کو اجتہادِ ثانی کی وجہ سے کالعدم قرار دیں تو ممکن ہے اجتہاد ثالث ثانی کو کالعدم کر دے اور ایسے ہی لامتناہی سلسلہ قائم ہو جائے اس طرح نقض اجتہاد سے تسلسل پیدا ہوگا اور تسلسل باطل ہے لہذا نقض اجتہاد بھی باطل ہوگا۔ قاضی یا سلطان بھی اپنے اجتہاد سے نافذ شدہ احکام کو کالعدم نہیں کر سکتا اور نہ دوسرا قاضی و سلطان کر سکتا ہے صاحب اشباہ والنظائر لکھتے ہیں کہ دو مسئلے ایسے ہیں جن میں نقض اجتہاد ضروری ہے۔

ایک یہ کہ اگر تقسیم میں غبن فاحش واقع ہو تو اس تقسیم کو کالعدم کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے اجتہاد میں شرائط کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، تقسیم میں معدلت شرط ہے شرط کے مفقود ہونے سے مشروط ہی باقی نہیں رہے گا۔

دوسرا مسئلہ یہ کہ اگر ایک حاکم نے کسی چیز کو مناسب سمجھا اور دوسرے نے اسے نامناسب سمجھا اگر یہ چیز امور عامہ سے ہے تو حاکم ثانی سابقہ فیصلہ کو کالعدم کر سکتا ہے۔

نقض اجتہاد اور عدم نقض کے بارے میں مولانا حموی شارح اشباہ والنظائر نے لکھا ہے کہ وہ اجتہاد ناقابل نقض ہوگا جو تمام شرائط کے مطابق ہو۔ ظاہر ہے جو اجتہاد ایسا نہ ہوگا اس کے نقض میں کلام نہ ہونا چاہیئے، اگر کوئی مجتہد اپنے اجتہاد میں خطا محسوس کرے تو دوبارہ اجتہاد کر کے اپنے سابقہ اجتہاد کو کالعدم کر سکتا ہے۔ چنانچہ ائمہ مجتہدین سے بعض مسائل میں رجوع ثابت ہے۔ غرض کہ ایک مجتہد دوسرے مجتہد کے اجتہاد کو کالعدم نہیں کر سکتا۔

اقسام مجتہدین

مجتہدین کے بھی بلحاظ تفقہ و علم و فضل کئی مدارج ہیں اور ان کے کتب کے بھی مختلف مدارج ہیں طبقہ مجتہدین کے گزر جانے کے بعد علمائے مابعد نے ان کی حسب ذیل اقسام پر

درجہ بندی کی ہے۔ (۱) مجتہد فی الشرع یا مجتہد مطلق (۲) مجتہد فی المذہب (۳) مجتہد فی المسائل (۴) اصحاب تخریج (۵) اصحاب ترجیح (۶) اصحاب تصحیح (۷) عام فقہاء۔

کیا اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا؟

یہ سوال یقیناً اہم ہے آیا فی زماننا کوئی مجتہد ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کا جواب مشکل نہیں جتنا کہ اس کو مشکل بنا دیا گیا ہے۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اجتہاد کا دور ختم ہو چکا، اب کوئی مجتہد پیدا نہیں ہوگا۔ بعض اہل علم کی بھی یہی رائے ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اجتہاد کا دروازہ قیامت تک کھلا رہے گا۔ اختتام اجتہاد کا عقیدہ محض اس بنا پر ہے کہ ائمہ کے دور کے بعد ایسے علمائے کرام پیدا نہیں ہوئے یا پھر مشہور نہیں ہوئے اور بعد کے دور میں علوم دینیہ کی جانب توجہ و میلان بہت ہی گھٹ گیا۔

اجتہاد کے ختم ہونے کا خیال نہ عقلاً درست ہے اور نہ نقلاً۔ نقل سے کہیں بھی یہ بات ثابت نہیں ہے کہ اجتہاد طبقۂ مجتہدین ماسبق کے زمانے کے ساتھ مخصوص تھا اور اس کی صرف انھیں کو اجازت تھی۔ عقلی طور پر یہ بات ناقابل فہم ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا۔ حوادث و نوازل کا وقوع پذیر ہونا کسی زمانے کے ساتھ محدود و مخصوص نہیں ہے لہٰذا نئے درپیش مسائل کو احکام معلوم کرنے کے لیے اجتہاد ضروری اور لابدی ہے ورنہ اس بات کی ضمانت دینی ہوگی کہ ائمہ سابقین جتنے مسائل بیان فرما گئے واقعاتِ عالم بھی اتنے ہی ہیں ان کے بعد کوئی واقعہ یا حادثہ وقوع پذیر نہ ہوگا۔ ایسا تو ہرگز نہیں کہا جا سکتا ایسا کہنا عالم بالغیب ہونے کا دعویٰ کرنا ہے۔ علم بالغیب سوائے خدا کے کسی کو نہیں۔ اجتہاد کو ختم کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ شریعت کو محدود و منجمد کر دیا جائے۔ جن وجوہ و اسباب کے تحت سابق میں اجتہاد ضروری تھا اب بھی اور آئندہ زمانے میں بھی وہی وجوہ و اسباب باقی رہیں گے۔ کتب فقہ میں کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں قیامت تک پیش آنے والے تمام مسائل بیان کر دیئے گئے ہوں اور نہ مجتہدین سابقین کو علم غیب تھا کہ وہ اپنی غیب دانی کی بنا پر تمام مسائل بیان کر دئیے ہوں۔ اصول فقہ کی کسی کتاب میں یہ مسئلہ نہیں ملتا کہ دور اجتہاد ختم ہو گیا۔ اگر ایسا ہوتا تو کتب اصول میں ضرور یہ اہم اصل مسئلہ مذکور ہوتا کیونکہ اصول کا فن ہر اصولی مسئلہ سے بحث کرتا ہے۔ مذاہب ائمہ اربعہ کی کسی کتاب میں کسی عالم نے بھی یہ نہیں لکھا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا حنابلہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ کوئی زمانہ بھی مجتہد سے خالی نہیں ہو سکتا۔ احناف کے پاس کسی زمانے کا مجتہد سے خالی ہونا جائز ہے۔ چنانچہ مولانا محب اللہ بہاری صاحب مسلم الثبوت لکھتے ہیں "یجوز خلو الزمان عن المجتهد شرعاً خلافاً للحنابلة" امام رازی نے یہ اعتراض کیا ہے کہ آیا ایسے مجتہد کا اتباع جائز ہے جو موجود نہ ہو۔ یہ امام رازی کی انفرادی رائے ہے۔ مجتہد مرحوم کی اتباع سے کوئی خرابی لازم نہیں آتی۔ بحث اجماع میں تمام اصول کی کتابوں میں لکھا گیا ہے کہ اجماع کسی زمانے سے مخصوص نہیں ہے۔ اجماع ہر زمانے میں ہو سکتا ہے اس کے ساتھ یہ بھی تصریح کی گئی ہے کہ

مجتہدین کا اجماع ہی معتبر اور قابلِ قبول ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اجازت اجماع اجازت اجتہاد کو مستلزم ہے۔ جس طرح اجماع ہر زمانے میں ہو سکتا ہے اسی طرح اجتہاد بھی ہر زمانے میں ہو سکتا ہے۔ بعض لوگ علامہ نسفی پر اجتہاد فی المذہب کے اختتام کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اجتہاد فی الشرع کے متعلق ان کا یہ خیال ہے کہ وہ ائمہ اربعہ پر ختم ہو چکا ایسے معتقدین کے متعلق مولانا بحر العلوم فرماتے ہیں کہ "ھٰذا ھوس عن ھوسا تھم" یعنی یہ خیال ان کے جنون میں سے ایک جنون ہے۔ اور انھیں اس حدیث "افتوا بغیر علم قد ضلوا و اضلوا" کے مصداق قرار دیتے ہیں بعض لوگ اختتام اجتہاد و مجتہد پر یہ دلیل لاتے ہیں کہ طبقہ مجتہدین گزر جانے کے بعد سے اب تک کوئی مجتہد پیدا نہیں ہوا۔ یہ دلیل غلط ہے کیونکہ عدم فی الماضی عدم فی الاستقبال" کو مستلزم نہیں بہت سی چیزیں ماضی میں معدوم تھیں اب موجود ہیں۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مجتہد فی الشرع یا مجتہد فی المذہب کی اب حاجت نہیں لیکن عدم حاجت منافی وجود بھی نہیں۔ عدم حاجت و ضرورت کی وجہ سے وجود امکانی کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مشاہدہ شاہد ہے کہ بہت سی بے ضرورت چیزوں کا وجود ہے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ انحطاط علم دین کے باعث بالفعل مجتہد پائے نہ جاتے ہوں لیکن بالقوہ مجتہدین کے پیدا ہونے کا امکان تو باقی ہے اور اس سے کسی کو انکار بھی نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(ادارہ)

فتویٰ و فیصلہ

اُصولِ فتویٰ نویسی

فتویٰ نویسی دین کا ایک اہم باعزت مشغلہ ہے اس کی فضیلت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ رب العزت جل جلالہ نے خود یہ صفت اختیار فرمائی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: یستفتونک قل اللہ یفتیکم الخ۔ فتویٰ بروزن فعلیٰ صیغہ صفت ہے یہ لفظ ف کے فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ آیا ہے۔ نیز فُتیا اور فِتیا بھی مستعمل ہے۔ دراصل یہ لفظ ناقص یائی ہے فتوی کو واو یاء سے بدلا ہوا ہے۔ یہ لفظ فتیٰ سے بھی مشتق ہے جس کے معنیٰ جوان، قوی اور کامل کے ہے۔ سخی اور بہادر کے معنیٰ بھی آتے ہیں گویا صاحب فتویٰ قوی بہادر اور کریم ہوتا ہے۔

اصطلاح شرع شریف میں اس کا استعمال ایسے موقع پر کیا جاتا ہے جبکہ کوئی حکم قوی اور محکم دلیل کے ساتھ ثابت ہو۔ مفتی کا درجہ مجتہد کے بعد ہے۔ مجتہد تو اصول شرع شریف سے مسائل کا استنباط کرتے ہیں اور مفتی مجتہد کے بتائے ہوئے اصول کے مدنظر احکام شرعی کی رہبری کرتے ہیں فی زماننا مفتی کا کام یہ ہے کہ جو فتویٰ بھی صادر کرے اس کے متعلق مجتہد کا قول کسی مستند کتاب فقہ کی روایت سے من وعن نقل کردے۔ موجودہ زمانے میں فتوی کا کام اسی حد تک رہ گیا ہے کہ صاحب مذہب کا قول نقل کر دیا جائے۔ بالفاظ دیگر موجودہ زمانے کے مفتی ناقلین ہیں۔ جن کے ذمہ تصحیح نقل کا فرض رہ گیا ہے۔ دیگر مراتب ومراحل فقہائے کرام شکر اللہ سعیہم انجام دے چکے ہیں۔ اِلا ما شاء اللہ کہ بعض حوادث و نوازل ہر زمانہ میں ایسے درپیش ہوتے ہیں جن کے متعلق کتب متقدمین میں کوئی صریح روایت نہیں ملتی با اینہمہ ان میں ایسے دلائل و اشارات پائے جاتے ہیں جن سے اس جدید مسئلہ حادثۃ الفتویٰ پر روشنی پڑ سکے۔ اب ہم کو اسی حد تک کام کرنا ہے۔

طبقات فقہاء علم و نقل اور تفقہ فی الدین کے اعتبار سے فقہائے کرام کی کُل سات طبقات ہیں۔

(۱) **مجتہد فی الشرع**:۔ یہ وہ ائمہ اسلام ہیں جو اصولِ اربعہ قرآن، سنت، اجماع اور قیاس سے راست طور پر اپنے اصول کے مطابق مسائل کا استنباط فرماتے ہیں۔ یہ وہ اصحاب ہیں جن کے متعلق قرآن مجید میں اشارہ کیا گیا ہے: "لعلمہ الذین یستنبطونہ منہم" جیسے ائمہ اربعہ مذاہب

اور ان کے معاصر مجتہدین۔

(۲) مجتہد فی المذہب:۔ یہ وہ ائمہ ہیں جو کسی امام کے اصول و اقوال کے مدنظر مسائل کا استنباط کرتے ہیں نیز خود ان کے بھی اپنے اصول ہوتے ہیں جن کی بناء پر مسائل کا استنباط فرماتے ہیں۔ جیسے ائمہ اربعہ کے اصحاب۔ مگر چونکہ ان کے مدونہ اصول اور مستنبط مسائل ان کے شیوخ و اساتذہ سے بھی مروی ہیں اس لیے ان کا کوئی مستقل مذہب نہیں بلکہ وہ اپنے شیخ و استاذ کے ہم مذہب سے شمار کئے جاتے ہیں۔ صاحبین یعنی امام محمدؒ و امام ابویوسفؒ اور امام زفرؒ اور امام حسن ابن زیاد وغیرہم کا شمار اسی قسم میں ہے۔

(۳) مجتہد فی المسائل:۔ یہ وہ ائمہ ہیں جو ایسے مسائل میں جو مذکور الصدر حضرات کے مستنبط مسائل میں نہ پائے جاتے ہوں یہ ان کا اصول امام کے پیش نظر استنباط کرتے ہیں۔ اصول کی حد تک تو وہ امام کے مقلد ہیں کیونکہ ان کے خود کوئی ذاتی اصول نہیں ہیں۔ البتہ فروع کی حد تک ان کا اجتہاد پایا جاتا ہے۔ جیسے امام طحاوی اور ان کے امثال۔

(۴) اصحاب تخریج:۔ یہ وہ اصحاب ہیں جن کو اجتہاد سے کوئی بہرہ نہیں ملا۔ مگر جس باب میں کوئی مسئلہ یا روایت نہ پائی جائے اس کو اپنے فقہاء سے امام کے اصول، مجتہدین فی المذہب و مجتہدین فی المسائل کی تصریحات کی روشنی میں ان کا حل دریافت کر لیتے ہیں جیسے امام کرخیؒ وغیرہ۔

(۵) اصحاب ترجیح:۔ یہ وہ اصحاب ہیں جو کسی مسئلہ کی نسبت ایک سے زیادہ مختلف روایتیں ان کے سامنے ہوں تو اپنی فقاہت سے ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس طبقہ کے فقہا، کسی جدید مسئلہ کا استخراج و استنباط نہیں کرتے بلکہ فقہائے بالا کے استخراج کئے ہوئے مسائل میں جو اختلاف پایا جاتا ہے ان میں سے کسی ایک قول کو مرجح قرار دیتے ہیں جیسے صاحب ہدایہ، امام قدوری، امام ابن ہمام وغیرہم۔

(۶) اصحاب تمیز:۔ یہ وہ اصحاب ہیں جو مخلوط مسائل کو اپنی قوت تفقہ کے ذریعے دریافت کر لیتے ہیں کہ فلاں مسئلہ فلاں امام کے اصول پر استخراج کیا گیا ہے اور فلاں مسئلہ فلاں امام کے اصول پر منطبق ہوتا ہے۔ کسی مختلف فیہ مسئلہ کا تصفیہ کہ اس میں مرجح کون ہے ان کا کام نہیں جیسے اصحاب متون صاحب مختار، صاحب کنز اور صاحب ملتقی الابحر وغیرہ۔

(۷) عام فقہاء:۔ جو اتنی لیاقت رکھتے ہیں کہ کتابوں کی عبارت سے صحیح مسئلہ معلوم کر لیتے ہیں اس طبقہ کے افراد کو اسبق طبقات کے کارناموں میں کسی قسم کا حظ یا بہرہ نہیں ملا۔ ان کا کام اس حد تک ہے کہ کتاب کا مطلب اپنی قابلیت کے لحاظ سے صحیح طور پر معلوم کر سکیں۔ جیسے فقہاء مابعد اور فقہائے زماں ان کا فریضہ کسی مسئلہ کی نسبت جو ان سے دریافت کیا جائے یہی ہوتا ہے کہ وہ کتب معتبرہ سے اس کو نقل کر کے بتلا دیں تصحیح نقل کا فرض ان کے ذمہ ہے۔ جیسے اس وقت کے علمائے امت اور مفتیان ملت۔

طبقات کتب طبقات فقہاء کی طرح ان کی تصانیف کی بھی علمی مدارج ہیں کسی کتاب کا درجہ

اس کے مصنف کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ کتب فقہ کے بھی حسب ذیل درجات ہیں:-

(۱) **کتب اصول**:- جن کا دوسرا نام ظاہر الروایہ ہے یہ چھ کتابوں کا مجموعہ ہے (۱) مبسوط۔ جس کا دوسرا نام کتاب الاصل ہے (۲) جامع کبیر (۳) جامع صغیر (۴) سیر کبیر (۵) سیر صغیر اور (۶) زیادات و زیادات الزیادات جو زیادات کا تکملہ ہے۔ یہ جملہ کتابیں حضرت امام محمد علیہ۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہما کی تصانیف ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ جن کتابوں میں امتیاز نہ کور رکھا گیا ہے از آں جملہ جو کبیر کے نام سے موسوم ہیں ان کی روایت حضرت امام اعظمؒ ہی سے ہے اور جو کتابیں صغیر کے لقب سے ملقب ہیں ان کی روایت حضرت امام اعظمؒ بتوسط حضرت امام ابو یوسفؒ کی گئی ہے۔ دراصل یہ کتابیں بھی حضرت امام اعظمؒ ہی سے مروی ہیں لیکن ان کی روایت حضرت امام محمدؒ کو راست امام اعظمؒ سے حاصل نہیں بلکہ حضرت امام ابو یوسف کے توسط سے حاصل ہے۔ کتاب الکافی للحاکم الشہید بھی اصول میں شامل کی جانے کی مستحق ہے۔ کیونکہ یہ کتب اصول کا خلاصہ اور اس کا مجموعہ ہے۔ جس کی شرح شمس الائمہ سرخسی نے لکھی ہے (۳۰) جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ ان کتابوں کا ظاہر الروایہ اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ ان کی روایت تواتر کے ساتھ مروی ہے۔

(۲) **کتب نوادر**:- یہ کتابیں بھی حضرت امام محمدؒ یا امام ابو یوسفؒ، امام زفرؒ یا امام حسن ابن زیاد لولوی وغیرہم اجلۂ اصحاب حضرت امام اعظمؒ یا ان کے تلامذہ کی تصانیف ہیں۔ ان میں جو مسائل درج ہیں وہ بھی حضرت امام اعظمؒ سے مروی ہیں جو آپ کے تلامذہ یا تلامذہ کے تلامذہ سے مروی ہیں تاہم ان کی روایت باعتبار تواتر یا شہرت کے اس درجہ پر نہیں جو ظاہر الروایت کو حاصل ہے۔ اس لیے ان کو نوادر کہا جاتا ہے۔ مثلاً امام محمدؒ کے تصانیف ہارونیات، جرجانیات، اور رقیات۔ امام ابو یوسفؒ کے تصانیف کتاب الامالی اختلاف ابی حنیفہ و ابن ابی لیلیٰ۔ امام حسن بن زیاد کی کتاب المجرد اور ان اصحاب کے شاگردوں کی تصانیف مثلاً نوادر معلی، نوادر ہشام، نوادر ابن رستم وغیرہ۔

(۳) **واقعات**:- ان میں وہ مسائل درج ہیں جو ظاہر الروایہ اور نوادر میں نہ ہونے کے باعث بعد کے مجتہدین نے اپنے اجتہاد سے استنباط کیا جیسے واقعات ناطفی اور فتاوی نوازل للفقیہ ابو اللیث السمرقندی وغیرہ۔

(۴) **متون**:- وہ کتابیں جن میں مذہب کے مسائل اختصار کے ساتھ لکھے گئے ہیں اور ان میں یہ احتیاط کی گئی ہے کہ کوئی مسئلہ ضعیف یا مرجوح نہ آنے پائے۔ مثلاً قدوری، کنز الدقائق، ملتقی الابحر، مختصر الوقایہ وغیرہ۔

(۵) **شروح**:- وہ کتابیں جو متون کی تشریح و توضیح کے لیے لکھی گئی ہیں اس میں متن کی تشریح کے علاوہ ضمناً اور مسائل بھی آجاتے ہیں، نیز مسائل متن کے دلائل بھی درج کئے جاتے ہیں جن سے معلوم ہو سکے کہ یہ مسئلہ فلاں نص یا حدیث یا قول صحابی یا اجماع وغیرہ سے ثابت ہے۔ جیسے ہدایہ، بحر الرائق، تبیین الحقائق، مستخلص الحقائق، در مختار، مجمع الانہر وغیرہ

(۶) **حواشی**:- وہ تقریریں جو متن یا شرح کے کسی مسئلہ پر توضیحاً لکھی گئی ہیں۔ حواشی پورے متن یا شرح کی

تشریح نہیں کرتے البتہ ضرورتاً جستہ جستہ کسی قول کی تو لہ قولہ کے ذریعہ تقریر و تثبیت کی جاتی ہے۔ مثلاً رد المحتار جس کا دوسرا نام شامی ہے۔ اسی طرح حاشیہ طحطاوی علی در المختار۔ حاشیہ ملا مسکین علی الکنز۔ عمدۃ الرعایہ علی شرح الوقایہ۔ حاشیہ عینی علی الہدایہ جس کا نام بنایہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

(۷) فتاویٰ:۔ یہ وہ کتابیں ہیں جو علماء امت سے مسلمانوں نے متفرق طور پر مسائل دریافت کئے اور انھوں نے ان کے جوابات دیئے اور ایک عرصہ کے بعد ان متفرق مسائل کو فصول و ابواب اور کتب پر مرتب کر کے ان کے مجموعے شائع کرا دیئے گئے۔ یا کسی عالم نے مسائل فقہیہ کو اپنی رائے کے مطابق کتب معتبرہ سے اخذ کر کے حسب ضرورت زمانہ انتخاب کیا اور انھیں مرتب کر کے شائع کیا جیسے فتاوی قاضی خاں، فتاوی ہندیہ جو فتاوی عالمگیریہ سے مشہور ہے۔ فتاوی التقرویہ، فتاوی غیاثیہ، فتاوی عتابیہ۔ جن کو دنیائے اسلام نے قبول کیا اور علمائے دین متین کے پاس مشہور و متداول رہے۔

(۸) متفرقات:۔ وہ کتابیں اور رسائل جو عہد متقدمین اور متاخرین کے بعد والے علماء نے عوام کی رہبری کے لیے لکھیں اور ہر زمانہ میں حسبِ ضرورت زمانہ لکھی جاتی رہیں گی مثلاً فتاوی نظامیہ، فتاوی رشیدیہ، فتاوی عبد الحی اور فتاوی صدارت العالیہ حیدر آباد وغیرہ وغیرہ۔

فرائض مفتی:۔ مفتی کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ جس مسئلہ پر فتویٰ لکھنا ہو اس کے متعلق احکام دریافت طلب میں کتب مسطورۃ الصدر میں علی الترتیب تلاش کرے۔ اصول میں نہ ملے تو نوادر، متون، شروح، حواشی و فتاویٰ دیکھے اور اگر کسی مسئلہ میں اختلاف پایا جائے تو عموماً متون شروح پر اور شروح حواشی پر اور حواشی فتاویٰ پر مقدم ہوں گے۔

بعض مسائل میں حضرت امام اعظمؒ کے ساتھ صاحبین اور دیگر اصحاب امام میں سے کسی کا اختلاف رہتا ہے تو فتاوی علی العموم حضرت امام اعظمؒ کے قول پر ہوگا مگر کسی مسئلہ میں صاحبین کا اختلاف ہو تو "قوت دلیل" دیکھی جائے گی یعنی اگر امام اعظمؒ کی رائے ایک ہو اور صاحبین اس سے مختلف ہوں تو اس صورت میں ہر ایک کی دلیل دیکھی جائے گی نیز اس پر بھی غور کیا جائے گا کہ فقہائے مابعد نے اس مسئلہ میں کس قول کو اختیار کیا ہے۔ نیز یہ دیکھا جائے گا کہ یہ اختلاف زمان و مکان پر تو مبنی نہیں ہے اگر یہی صورت ہے تو در اصل کوئی اختلاف ہی نہیں ہے یعنی امام اعظمؒ کے زمانے میں جو حالات تھے اور جن کی بنیاد پر آپ نے وہ اجتہادی حکم دیا تھا اب زمانہ مابعد میں وہ احوال باقی نہیں رہے بلکہ حالات بدل گئے تو حالات کے بدلنے سے احکام کا بدلنا ایک بدیہی امر ہے ان صورتوں میں اختلاف نہیں سمجھا جائے گا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اختلاف کی صورت میں کسی مسئلہ کے ساتھ "ہو الصحیح"، "ہو الصواب" اور اس کے ہم معنی الفاظ لکھے رہتے ہیں اس صورت میں جس مسئلہ کے ساتھ الفاظ بالا لکھے ہوئے ہوں اسی پر فتویٰ ہوگا۔ کبھی دونوں اختلافی مسئلوں کے ساتھ یہ الفاظ ملتے ہیں تو یہ "اختلاف تصحیح" کی صورت ہے۔ اس صورت میں بھی دلیل اور اختلاف زمان و مکان وغیرہ

پیش نظر رکھنا ہوگا۔ بعض اوقات کسی مسئلہ کو اصحاب ترجیح مرجح قرار دیتے ہیں اس صورت میں مخالف قول مرجوح قرار پائے گا۔ اور قول مرجوح پر فتوی دینا درست نہ ہوگا۔ لہذا فتوی مرجح قول پر دیا جائے گا۔ یہاں بھی ایسا ہوتا ہے کہ اختلاف تصحیح کی طرح "اختلاف ترجیح" کی صورت رونما ہوتی ہے۔ لہذا اس کا تصفیہ بھی اشارات بالا کے مد نظر کیا جائے گا، یعنی قوت دلیل، اختیار فقہائے مابعد، اختلاف زمان و مکان، ہو الصحیح ہو الصواب، اختلاف تصحیح اور اختلاف ترجیح کے اصول کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

فقہائے کرام نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ عموماً فتوی حضرت امام اعظمؒ کے قول پر دیا جائے لیکن یہ دوسرے فقہاء کے نزدیک محل نظر ہے۔ البتہ مسائل کی تقسیم کی گئی ہے۔ عبادات میں عموماً حضرت امام اعظمؒ کے قول کو ترجیح حاصل رہے گی۔ قضا و شہادات میں حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول کو ترجیح دی جائے گی کیونکہ امام ثانی کو قاضی القضاۃ ہونے کی وجہ سے ان ابواب میں زیادہ تجربہ اور بصیرت حاصل تھی اور کوئی مسئلہ حساب و ریاضی اور لغت سے متعلق ہو تو اس میں حضرت امام محمدؒ کا قول معتبر ہوگا کیونکہ ان علوم میں امام ثالث کو ید طولی حاصل تھا۔ حضرت امام زفرؒ کے صرف سولہ سترہ مسائل گنتی کے ہیں جن کو فقہاء نے اپنی کتابوں میں یکجا کر دیا ہے۔ ان مسائل میں امام زفرؒ کے قول کو ترجیح ہوگی۔

نیز یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ حضرت امام اعظمؒ یا ان کے کسی شاگرد کے قول پر امت کا عمل جاری ہو گیا ہو تو قطع نظر اس کے کہ دلیل کن کی قوی ہے اور کن کی ضعیف نیز اس سے بھی قطع نظر کہ ظاہر الروایہ میں کیا ہے اور نوادر وغیرہ کیا کہتے ہیں۔ جب کسی مسئلہ پر تعامل الناس اور عموم بلوی ہو گیا ہو تو مفتی کو چاہیے کہ اس کے خلاف فتوی نہ دے۔ کسی قول پر امت کا عمل در آمد ہونا یعنی تعامل الناس کی بھی ایک صورت ترجیح عمل کی ہے۔ اس کے خلاف فتوی دینا انتشار امت کا موجب ہے مفتی کو اس سے احتراز کرنا چاہیے۔ چنانچہ اذان عند المنبر کا مسئلہ جس کی بعض فقہائے ہند نے ہمارے زمانے میں تحقیق کی ہے اور اس تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ محقق کا قول ہی اقرب الی الصواب ہے مگر چونکہ عمل در آمد ایک عرصہ دراز سے بلا انکار نکیر شرقاً و غرباً جمعہ کے دن منبر کے پاس اذان دینے کا توارث و تواتر چلا آرہا ہے اب اس کے خلاف ان تحقیقات مابعد پر عمل کرنا موجب فتنہ و انتشار ہے۔

اصول فیصلہ نویسی

فیصلہ نویسی شرع شریف کا ایک اہم باب ہے اور یہ بھی نبوت کا ایک خاص شعبہ ہے باری تعالی کا ارشاد ہے وعلمنٰہ الحکمۃ و فصل الخطاب۔ حضرت داود علیہ السلام کی نسبت یہ ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے ان کو حکمت یعنی محکم فیصلے اور فصل خطاب یعنی ایک کلام کو دوسرے کلام سے متمیز کرنے کا طریقہ سکھایا ہے۔ فصل الخطاب کی تفسیر میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ حمد و صلاۃ کے بعد اما بعد جو کہا جاتا ہے یہ فصل الخطاب ہے کیونکہ متکلم حمد و صلاۃ کے ذریعے خدا اور رسول کی طرف متوجہ تھا اس سلسلہ کو ختم کر کے اب وہ مقصود کی طرف رجوع ہو رہا ہے اور اما بعد

اس فصل وتمیز کو ظاہر کر رہا ہے۔ اور حکمت کسی چیز کو پختہ اور مستحکم کرنا۔ چونکہ قاضی کے فیصلہ سے مستحق اپنے حق کو محکم طریق پر حاصل کر لیتا ہے کہ اس کے بعد پھر کوئی اس سے چھین نہیں سکتا۔ یہ حکمت ہے۔ احقاق حق اور ابطال باطل چونکہ قاضی کا کام ہے اس لیے اصول قضاء اور اس کے آداب و احکام کو کتاب القضاء باب القاضی سے کیا جاتا ہے۔ قضا کے لغوی معنی حکم کے ہیں اور اصطلاح شرع میں فصل خصومات اور قطع منازعات کو قضاء کہتے ہیں۔ باب قضاۃ نہایت وسیع ہے اور اہم بھی۔ اسی وجہ سے قرآن کریم اور احادیث شریفہ میں اس کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ اس کی فضیلت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے خود اپنے کو اس صفت سے یاد فرمایا ہے جیسے یقضی بالحق وغیرہ مختلف طریقوں سے اس فعل کو اپنی ذات اقدس کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ اسی طرح پیغمبروں کو اس کا حکم فرمایا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہو رہا ہے وان احکم بینھم بالحق یعنی آپ ان لوگوں کے درمیان میں حق حق فیصلہ کیا کیجئے۔

یہ اصولی بات ہے کہ جس امر کی زیادہ فضیلت بیان کی جاتی ہے اور جہاں جس چیز پر زیادہ زور دیا جاتا ہے وہیں اس کی ذمہ داریاں بھی ساتھ ساتھ بڑھ جاتی ہیں۔ چنانچہ قاضی کے متعلق آیا ہے من تقلد بالقضاء فقد ذبح بغیر سکین۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر فیصلہ حق کیا تو بسا اوقات فیصلۂ حق خواہش نفس کے خلاف ہوتا ہے اور اگر ناحق فیصلہ کیا تو اس کی ذمہ داری عند اللہ و عند الناس قاضی کے دوش پر رہی۔ ہر دو صورتوں میں نتیجہ ذبح بغیر سکین ہی رہا۔ انہی اسباب کے پیش نظر اکابر ائمہ دین اس خدمت کو قبول کرنے سے اعراض و پہلوتہی فرماتے رہے اور جہاں تک ممکن ہو سکا اس سے بچنے کی کوشش کی حضرت امام اعظمؒ نے جان دینا گوارا کیا اور جان دے دی مگر اس خدمت سترگ کو قبول نہ فرمایا۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ خدمت قضاۃ واجب علی الکفایہ ہے۔ اس سے گریز اس صورت میں جائز ہے جبکہ اس کی صلاحیت اور اہلیت رکھنے والے دوسرے موجود ہوں۔ اور اگر صورت حال یہ ہو کہ کوئی اس کا اہل دوسرا نہیں مل سکتا تو ایسی حالت میں شخص اہل پر اس کا قبول کرنا بلکہ کوشش کر کے اس کو حاصل کرنا فرض عین ہو جاتا ہے۔ ہماری اس تقریر سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ جن بزرگوں نے اس سے گریز کیا تو کیوں کیا اور جنھوں نے قبول کیا یا اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی تو کیوں کی۔

قاضی کے پاس جب کوئی مقدمہ پیش ہو تو اس کو چاہیے کہ اولاً غور کرے کہ مقدمہ پیش کرنے والا اس کا حق رکھتا ہے یا نہیں۔ بصورت ثانی اس کو قبول نہ کرے۔ اور صورت اولیٰ میں یہ دیکھے کہ مطالبہ واضح ہے یا مبہم۔ مبہم ہو تو اس کی وضاحت طلب کرے۔ واضح ہونے کی صورت میں فریق ثانی کو اس سے مطلع کرے اور اس کا جواب طلب کرے۔ فریق ثانی کا جواب اگر اثبات میں ہو تو اس کے موافق فیصلہ صادر کرنا آسان ہوگا۔ اور اگر فریق ثانی کا جواب نفی میں ہو تو فریق اول سے ثبوت طلب کرے۔ یہ ثبوت

بصورتِ دستاویز ہو یا گواہ کی صورت میں، دونوں کو طلب کرے۔ پھر گواہوں کا بیان قلمبند کرے اگر شہادت دستاویز میں مطابقت پائی جائے تو فبہا ورنہ دستاویز کو کالعدم تصور کرے۔ بعد ازاں فریق ثانی کو گواہوں پر جرح کا موقعہ دے، اسی طرح دستاویز کے خلاف اگر کوئی مواد فریق ثانی کے پاس موجود ہو تو اس کو طلب کرے۔ اس تمام کارروائی سے مقدمہ کی صورتِ حال واضح ہو جائے گی اور اس نوبت پر فیصلہ آسان ہوگا۔ اگر فریق اول کے پاس دستاویز اور گواہ موجود نہ ہوں اور فریق ثانی کو انکار ہو تو الیمین علی من انکر کے پیش نظر اس صورت میں فریق ثانی کو حلف دیا جائے گا اور اگر وہ حلف اٹھالے تو مقدمہ خارج کر دیا جائے گا۔ لیکن حلف سے اعراض کرنے کی صورت میں مقدمہ فریقِ اول کے حق میں فیصل کیا جائے گا۔ یہ فیصلہ کا ایک مجمل خاکہ ہے۔

بحالاتِ موجودہ ہر نوبتِ کارروائی پر بہت سارے معارضات اور موانعات درپیش ہوتے ہیں ان پر غور کرنا قاضی کا فرض ہے۔ دورانِ مقدمہ میں فریقین کی طرف سے بعض بیانات اور مقدمے کے اجزاء اس نوعیت سے پیش ہوتے ہیں کہ کسی جزء کی حد تک مدعی، مدعی علیہ اور مدعی علیہ، مدعی ہو جاتے ہیں ایسی صورت میں اس نئی چیز کی حد تک بارِ ثبوت مدعی پر اور جواب دہی مدعی علیہ کے دوش پر رکھنا ہوگا۔ اس نوبت پر فیصلہ سے پہلے تنقیحات قایم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے یہ تنقیحات ہی اس مقدمہ کے اہم اجزاء ہوتے ہیں۔ جس تنقیح کا بارِ ثبوت جس شخص کے ذمہ عائد ہوتا ہے اسی کو اس کا ذمہ دار بنایا جائے گا اور طرفِ ثانی سے جواب دہی کے لیے کہا جائے گا۔ قیامِ تنقیحات سے انفصالِ مقدمہ میں سہولت پیدا ہوتی ہے۔ اور صحیح رائے قایم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اگر کسی فریق کی طرف سے کسی تنقیح سے متعلق کوئی اعتراض پیش ہوگا اس کی ضرورت نہیں یا یہ کہ اس کا بارِ ثبوت اس کے دوش پر نہیں رکھا جا سکتا بلکہ فریق ثانی کو اس کا ذمہ دار گردانا چاہیے۔ تو قاضی کو چاہیے کہ اس پر غور کرے اس کے بعد کسی فریق سے اس کا متعلق قرینِ قیاس پایا جائے تو اس سے متعلق کر دے۔ اسی طرح کوئی تنقیح طلب امر غیر ضروری قرار پائے تو اس کو خارج کر دے یا ضرورتِ ترمیم پائے تو اس میں ترمیم کرے۔ بہر حال کوشش اس امر کی ہونی چاہیے کہ مقدمہ کی صحیح صورتِ حال سامنے آجائے اور اس کے تمام اجزاء پر مکمل بحث ہو اس طرح کہ کسی جزء کے متعلق کوئی تشنگی باقی نہ رہے۔ تب چل کر فیصلہ صادر کرے فیصلہ جہاں تک ہو سکے مفصل و مدلل ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کو غیر ضروری طور پر طول دیا جائے بلکہ ایجاز مخل اور اطناب ممل سے وہ خالی رہے۔ قاضی کا فیصلہ اس کے مذہب اور مسلک کی روشنی میں ہوگا۔

فتاویٰ نظامیہ

سوال: بے نمازی کس کو کہتے ہیں اگر کوئی شخص عمر بھر میں ایک نماز یا دو نماز پڑھے تو اس پر بے نمازی کا اطلاق ہوگا یا نہیں؟ بے نمازی کے معنی کوئی دوسرے بھی ہو سکتے ہیں یا کیا اور اس پر احکام کیا نافذ ہوں گے؟

جواب: بے نمازی کو عربی میں "تارک الصلوٰۃ" کہتے ہیں جو شخص ایک وقت کی نماز ترک کرتا ہے اس کو بھی ترکِ نماز کے اعتبار سے بے نمازی کہا جائے گا اور جو عمر بھر نہیں پڑھتا وہ تو تمام عمر کا بے نمازی ہے بلکہ اس کو عربی میں "مصر علی ترک الصلوٰۃ" کہا جاتا ہے۔ جس کے معنی بار بار نماز کو ترک اور ترک پر اصرار کرنے والا ہے۔ یعنی جس طرح کہ ایک دفعہ چوری کرنے والے اور ایک دفعہ شراب پینے والے اور زنا کرنے والے کو محض سارق و شارب و زانی کہتے ہیں اور بار بار کرنے والے کو سارق مصر و شارب مصر زانی مصر کہتے ہیں۔ اسی طرح بے نمازی کا حال ہے بلکہ حضرت عمرؓ اور عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور معاذ بن جبلؓ و ابوہریرہؓ صحابۂ کرام سے مروی ہے کہ جو شخص جان بوجھ کر ایک وقت کی نماز ترک کرے اور وقت گزرنے تک بیٹھا رہے وہ کافر و مرتد ہے (مشکوٰۃ شریف مطبوعہ نظامی دہلی صـ۴۹ کے حاشیہ پر ترغیب و ترہیب امام منذری) مگر شافعیؒ حنفیؒ و مالکیؒ و جمہور سلف و خلف کے پاس جان بوجھ کر سستی و کاہلی سے نماز ترک کرنے والا فاسق ہے کافر نہیں۔ صحابۂ کرامؓ سے جو روایات کفر و ارتداد کے متعلق مروی ہیں وہ زجر و توبیخ پر محمول ہیں (در المختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ا صـ۲۴۶) (نووی شرح مسلم ج ا باب من ترک الصلوٰۃ متعمداً) ایسے شخص کے متعلق شرعاً یہ حکم ہے کہ وہ قید کیا جائے تا کہ نماز کا پابند ہو جائے (در المختار ج ا صـ۲۴۶) (نووی شرح مسلم جلد ا) اور بعض علماء ایسے شخص کو خون نکلنے تک مارنے کے لیے حکم دیتے ہیں بلکہ امام شافعی صاحبؒ تو ایک نماز کے اس طریقہ سے ترک کرنے پر بھی قتل کا حکم دیتے ہیں (در مختار صـ۲۴۶) اور جب توبہ کر کے پچھلی نمازیں قضا کر لے اور آئندہ کے لیے پابند ہو جائے تو پھر اس پر آئندہ سے بے نمازی کا اطلاق نہیں ہوگا کیونکہ یہ شخص فاسق یعنی مرتکب گناہ کبیرہ ہے جس کی توبۂ واثق عند اللہ مقبول ہے (نفع المفتی والسائل مطبوعہ مصطفائی صـ۲۲) پس صورت مسئولہ میں عمر بھر میں ایک دفعہ یا دو دفعہ نماز پڑھنے والا بلکہ تمام عمر پڑھ کر ایک دو دفعہ سستی سے نماز ترک کرنے والا یہ سب شرعاً بے نمازی ہیں اور ان پر حسبِ تفصیل سابق احکام نافذ ہوں گے۔

سوال: ایک شخص قراءتِ قرآن میں اس طرح غلطی کرتا ہے کہ اس کی زبان سے ادائی مخرج کے وقت ولا الضالین یا ولا الذالین یا ولا الزالین و النعمت کی جگہ انامت ادا ہوتا ہے آیا ایسے شخص کی امامت جائز ہے یا نہیں۔

جواب:۔ شرعاً ایسے شخص کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ ادائی حروف میں کوشش کرے اور اپنے کو معذور نہ بنائے اگر بعض حروف ایسے ہیں کہ اس کی زبان سے نکل بھی نہیں سکتے تو اس کو چاہیے کہ نماز میں سورہ فاتحہ کے بعد ایسی آیتیں پڑھا کرے کہ جن میں وہ حروف نہیں ہیں اور سورہ فاتحہ ہر حالت میں واجب ہے اور اگر اس کو ایسی آیتیں قرآنِ شریف میں نہیں ملتی ہیں۔ اس لیے وہ انھیں کو پڑھتا ہے تو ایسی حالت میں تمام فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس کی نماز تو جائز ہے مگر امامت جائز نہیں۔ اگر وہ ان آیتوں کے ملتے ہوئے ایسی آیتیں نماز میں پڑھتا ہے کہ جن میں وہ حروف ہیں جو اس کی زبان سے صاف ادا نہیں ہوتے تو ایسی صورت میں بعض فقہاء کا یہ قول ہے کہ اس کی نماز جائز نہیں اور یہی مذہب صحیح ہے (فتاویٰ عالمگیریہ ج ۱ ص ۷۹) یہ اس شخص کا حال ہے جس کی زبان میں لثغہ یعنی لکنت نہیں ہے بلکہ فطرتاً اس کی زبان ایسی سخت ہے جس سے بخوبی ادائی مخارج دشوار ہے لیکن وہ شخص جس کی زبان میں لکنت ہے تو ایسے شخص کا صاف زبان والوں کی امامت کرنا غیر صحیح اور فاسد ہے (فتاویٰ خیریہ ج ۱ ص ۱) اگر لکنت بہت خفیف اور تھوڑی ہے تو اس کے لیے شیخ الاسلام زکریا و شافعیؒ کا قول ہے کہ مؤثر نہیں (فتاویٰ خیریہ ج ۱)

سوال:۔ سحر کے وقت کی ابتدا کب سے ہوتی ہے اور انتہا کب تک ہے بحوالہ کتب تحریر فرمائیے؟

جواب:۔ سحر کا وقت رات کے سدس اخیر میں یعنی رات کے اخیر والے چھٹے حصے سے شروع ہوتا ہے (فتاویٰ عالمگیریہ ج ۱ ص ۳۰) پس روزہ دار کو چاہیے کہ طلوع و غروب آفتاب کو ٹھیک طور پر دریافت کرنے کے بعد مابین طلوع و غروب جس قدر وقت رہے اس کے چھ حصہ کرلے ابتدائے شب سے پانچ حصہ چھوڑ دے اب جو اخیر والا چھٹا حصہ رہ جائے گا اس کے شروع ہوتے ہی سحر مسنون کا ابتدائی حصہ شروع ہوجاتا ہے۔ علم ہیئت کے قاعدہ سے یہ امر ثابت ہے کہ جب آفتاب افق سے اٹھارہ درجہ نیچے ہوتا ہے تب صبح کاذب طلوع ہوتی ہے جو سحر کا انتہائی اور نمازِ صبح کا ابتدائی وقت ہے۔ پس حیدرآباد میں جس زمانے میں کہ رات چھوٹی سے چھوٹی یعنی (۱۰) گھنٹے (۵۴) منٹ کی ہوگی سحر مسنون کی ابتدا (۳) بج کر (۳۸) منٹ سے ہوگی اور انتہا (۴) بج کر (۳۷) منٹ تک اور جوں جوں رات بڑھتی جائے گی ان اوقات میں اختلاف ہوتا جائے گا یہاں تک کہ جب رات اور دن مساوی ہوجائیں تو ابتدائے وقت سحر مسنون (۴) سے ہوگا اور انتہا (۵) تک پھر بعد مساوات جس قدر رات کی زیادتی دن سے ہوتی جائے گی اوقات میں اختلاف ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب رات (۱۳) گھنٹے (۴) منٹ کی ہوگی۔

سوال:۔ تصورِ شیخ بحالتِ نماز شرعاً درست ہے یا نہیں اور اس تصور سے اگر کسی کو نماز کی حالت میں وجد و بیخودی اس درجہ لاحق ہو کہ کانپ کر گر پڑے یا آواز سے روئے تو کیا نماز باقی رہے گی؟

جواب:۔ مصلی کو چاہیئے کہ نماز میں خداوندِ عالم کا تصور کرے اور دل کو تمام علائقِ دنیا سے خالی کرکے معبودِ حقیقی کی طرف متوجہ کرے گویا مصلی خداوندِ عالم کو دیکھ رہا ہے اور اس کے روبرو نہایت مؤدب کھڑا ہے اگر یہ تصور قایم نہیں ہو سکتا تو اس طرح تصور کرے کہ گویا خداوندِ عالم اس کو دیکھ رہا ہے اس لیے اس کی عبادت میں اس طرح کھڑا ہوتا ہے اور تمام حرکات و سکنات میں اسی کا خیال رکھتا ہے۔ حدیث صحیح ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک کی شرح میں عینی شرح بخاری ج ۱ صـــ ۳۳۵ میں ہے قولہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔ قال النووی ھذا اصل عظیم من اصول الدین وقاعدۃ مہمۃ من قواعد المسلمین وعمدۃ الصدیقین وبغیۃ للسالکین وکنز العارفین وآداب الصالحین وتلخیص معناہ ان تعبد اللّٰہ عبادۃ من یری اللّٰہ تعالیٰ ویراہ اللّٰہ تعالیٰ فانہ لا یستبقی شیئا من الخضوع والاخلاص وحفظ القلب والجوارح ومراعاۃ الآداب مادام فی عبادتہ وقولہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک یعنی انک تراعی الادب اذا رایتہ وراک لکونہ یراک لا لکونک تراہ وھذا المعنی موجود وان لم تراہ لانہ یراک وحاصلہ الحث علی کمال الاخلاص فی العبادۃ ونہایۃ المراقبۃ (فتح الباری ج ۳ صــ ۱۱) میں ہے احسان العبادۃ الاخلاص فیہا والخشوع وفراغ البال حال التلبس بہا ومراقبۃ المعبود واشار فی الجواب الی حالتین ارفعھا ان یغلب علیہ مشاہدۃ الحق بقلبہ حتی کانہ یراہ بعینہ وھو قولہ کانک تراہ الا وھو یراک والثانیۃ ان یستحضر ان الحق مطلع علیہ یری کل ما یعمل وھو قولہ فانہ یراک وھاتان الحالتان یثمرھما معرفۃ اللّٰہ وخشیتہ۔

پس صورتِ مسئولہ میں بحالتِ نماز خداوندِ عالم کے سوا کسی چیز کا تصور درست نہیں البتہ خارج از نماز اوراد و وظائف میں شیخ کا تصور کرنا مشائخ چشتیہ کے پاس رکن اعظم سمجھا گیا ہے۔

حضرت مولانا مفتی رحیم الدین صاحب مدظلہ
شیخ الفقہ جامعہ نظامیہ

سوانح حیات

شیخ الاسلام حضرت مولانا شاہ انوار اللہ خاں بانی جامعہ نظامیہ علیہ الرحمۃ

سلسلہ (۱)

الحمد للہ حمد الشاکرین والصلاۃ والسلام علی رسولہ الامین سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ وعلماء امتہ اجمعین

امابعد اضعف العباد بندہ کمترین محمد رحیم الدین بن محمد سراج الدین عرض پرداز ہے کہ حضرت علامہ فہامہ مولانا ومقتدانا عارف باللہ حقایق ومعارف آگاہ شریعت وطریقت دستگاہ حافظ محمد انوار اللہ بن حافظ مولانا قاضی ابو محمد شجاع الدین رحمۃ اللہ علیہما وقدس اسرارہما سیدنا فاروق اعظم امیر المومنین ابو حفص عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ عنا کی اولاد امجاد سے تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب (۳۸) واسطوں سے حضرت فاروق اعظم سے جا ملتا ہے۔ جس کی تفصیل بحوالہ مطلع الانوار مولفہ استاذی وشیخی علامہ مفتی محمد رکن الدین رحمۃ اللہ علیہ سابق ناظم جامعہ نظامیہ یوں ہے:۔

مولانا قاضی محمد انوار اللہ بن مولانا حافظ قاضی ابو محمد شجاع الدین بن قاضی سراج الدین بن بدر الدین بن برہان الدین بن سراج الدین بن تاج الدین بن قاضی عبد الملک بن تاج الدین بن قاضی محمد کبیر الدین بن قاضی محمود بن قاضی کبیر بن قاضی محمود بن قاضی احمد بن قاضی محمد بن یوسف بن زین العابدین بن نور الدین بن شمس الدین بن شریف جہاں بن صدر جہاں بن اسحاق بن مسعود بن بدر الدین بن سلیمان بن شعیب بن احمد بن محمد بن یوسف بن شہاب الدین علی الملقب بہ فرخ شاہ کابلی بن شیخ اسحاق بن شیخ مسعود بن عبد اللہ اصغر بن عبد اللہ اکبر ابو الفتح بن اسحاق بن ابراہیم بن سیدنا ناصر بن سیدنا عبد اللہ بن سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

آپ کے نانا حضرت قاضی محمد سعد اللہ صاحب گنوری بھی جدی سلسلے میں آ ملتے ہیں۔ جن کا سلسلۂ نسب یوں ہے:۔ قاضی محمد سعد اللہ بن قاضی عزیز اللہ بن قاضی عبد القادر بن قاضی مراد بن قاضی علی بن قاضی محمود بن قاضی محمد کبیر الدین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین جو مولانا کی نویں پشت کے جد ہیں۔ غرض مولانا پدری و مادری ہر دو طریقوں سے فاروقی النسب ہیں۔

مولانا کے والد ماجد قاضی ابو محمد شجاع الدین صاحب بڑے پایہ کے عالم گزرے ہیں جو ۱۲۳۵ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن قندھار دکن کے مشہور عالم مولانا غلام جیلانی صاحب سے پائی۔

اس کے بعد حیدر آباد تشریف لائے۔ قرآن کریم کا حفظ کیا اور تجوید سے فارغ ہو کر مولوی کرامت علی صاحب (شاگرد مولانا شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی) سے دینیات کی تکمیل کی۔ علوم ظاہری کے علاوہ علوم باطنی سے بھی فیضیاب ہوئے۔ ابتداءً سلسلۂ قادریہ و نقشبندیہ میں اپنے نانا حضرت مولانا شاہ محمد رفیع الدین قندھاریؒ (خلیفہ حضرت شاہ رحمت اللہ نائب رسول اللہ) سے بیعت کی اور خلافت سے سرفراز فرمائے گئے جو بارھویں صدی میں بڑی جلالت و شان کے عالم گزرے ہیں اور اپنی متعدد تصانیف کے باعث گروہ صوفیہ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر حضرت حافظ محمد علی صاحب خیرآبادی نزیل حیدر آباد سے طریقہ چشتیہ میں بیعت کی۔ حضرت حافظ صاحب کی آپ پر خاص نظرِ عنایت تھی۔ اس لیے حلقہ درس میں آپ ہی مثنوی شریف سنایا کرتے۔ حضرت شاہ سعد اللہ صاحب (خلیفہ حضرت مولانا شاہ غلام علی صاحب دہلوی) آپ کے پیر صحبت تھے۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

العرض آپ کے ظاہری و باطنی کمالات کی شہرت ہوئی تو نواب سراج الملک بہادر مدار المہام وقت نے ازراہِ قدردانی ۱۲۶۳ھ میں منصفی دھارور پر آپ کا تقرر فرمایا چودہ سال تک آپ دھارور، راجورہ اور بیڑ پر خدمت منصفی نہایت قابلیت اور نیک نامی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔

۱۲۷۷ھ میں نواب سرسالار جنگ اول نے ضلع کی صدر منصفی پر ترقی دی جو اس زمانے میں ایک اعلیٰ عہدہ سمجھا جاتا تھا۔ اور "میر عدل" کے لقب سے اس کو یاد کیا جاتا تھا۔ ۱۲۸۱ھ میں آپ کا تبادلہ اورنگ آباد پر ہوا جبکہ آپ کی عمر ۵۵ سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ تو آپ نے بوجہ کبر سنی و خرابی صحت، خدمت سے سبکدوشی چاہی اس طرح آپ ۱۲۸۱ھ میں وظیفہ حسن خدمت حاصل کر کے حیدر آباد تشریف لائے ۱۲۸۸ھ میں بعارضہ ضیق النفس رحلت فرمائی۔ اور مولانا حافظ میر شاہ شجاع الدین حسین صاحب برہان پوری (خلیفہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب قندھاری) کے مقبرے میں مدفون ہیں۔ عبد اللہ حسین صاحب اشفر نے تاریخ وفات کہی ہے:-

گفت تاریخ رحلتش اشفر　　رحمتِ رب بروحِ اطہر باد

۱۲　ھ　۸۸

مولانا حافظ ابو محمد شجاع الدین صاحب کی دو بیویاں تھیں۔ پہلی بیوی حضرت سائیں سلطان مشکل آسان قندھاریؒ کے سجادہ نشین صاحب کی صاحبزادی، دوسری حضرت محمد سعد اللہ صاحب قاضی کلمنوری کی صاحبزادی جن کے بطن سے دو صاحبزادے ایک مولانا حافظ محمد انوار اللہ صاحب دوسرے حضرت مولوی محمد امیر اللہ صاحب اور دو صاحبزادیاں تھیں۔ بڑی صاحبزادی کے بطن سے مولوی عبد المجید صاحب تحصیلدار اور چھوٹی صاحبزادی کے بطن سے مولوی سید علی صاحب پیدا ہوئے۔ موخر الذکر سے حضرت مولانا حافظ محمد انوار اللہ صاحب کی صاحبزادی منسوب ہوئیں جن کا بیان آگے آئے گا۔

حضرت مولانا حافظ محمد انوار اللہ صاحب ۴ ربیع الآخر ۱۲۶۴ھ بمقام ناندیڑ تولد ہوئے۔ آپ کی والدہ محترمہ فرماتی تھیں کہ شادی کے بعد عرصہ تک انھیں کوئی اولاد نہیں ہوئی تو میاں نجے حضرت یتیم شاہ صاحب مجذوب کی خدمت میں کچھ میوہ بھیج کر دریافت کروایا کہ ایا مجھے اولاد ہوگی یا نہیں؟ شاہ صاحب نے کہلا بھیجا کہ لڑکا ہوگا عالم و فاضل ہوگا۔ اس کے بعد جب آثارِ حمل دکھائی دیئے تو میں نے خواب دیکھا کہ حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تلاوت کلام مجید فرما رہے ہیں۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم والد ماجد کے پاس گھر ہی میں آغاز ہوئی۔ جب آپ کی عمر شریف سات سال کی ہوئی تو آپ کو حافظ امجد علی صاحب نابینا کے تفویض کیا گیا۔ گیارہ سال کی عمر میں حفظِ کلام پاک سے فارغ ہوئے تو والد ماجد کے زیرِ تعلیم رہے۔ فقہ کی چند کتابیں مولوی فیاض الدین صاحب اورنگ آبادی سے پڑھیں پھر حضرت مولانا محمد عبد الحلیم صاحب انصاری فرنگی محلی (صدر دار العلوم) اور ان کے فرزند رشید حضرت مولانا ابو الحسنات محمد عبد الحی صاحب انصاری فرنگی محلی سے فقہ و اصول کی تکمیل کی۔ تفسیر حضرت مولانا عبد اللہ یمنی نزیل حیدر آباد سے حاصل کی اور حدیث کی سند بھی موصوف ممدوح ہی سے لی۔

مولانا کو تحصیلِ علم کا شوق اس درجہ تھا کہ روزانہ بلا ناغہ حضرت مولانا ابو الحسنات کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ بُعدِ مسافت یا موسلا دھار بارش اور دیگر عوارض و موانع کا خیال نہ فرماتے۔ بعض اوقات وہاں پہنچنے کے بعد معلوم ہوتا کہ آپ کے ہم درس مولوی وحید الزماں (وقار نواز جنگ) نہیں آئے ہیں تو ان کے مکان پر جاتے اور ساتھ لاکر تشنگیٔ علم بجھاتے اور حضرت مولانا ابو الحسنات آپ کے اس شوق کی قدر فرماتے اور باوصف کثرتِ مشاغل کبھی ناکام نہ لوٹاتے۔ چنانچہ اپنے ایک مشہور رسالہ حل المغلق فی بحث المجہول المطلق میں ارقام فرمایا ہے:۔

الفتہا حین قراءۃ الذکی المتوقد المولوی الحافظ محمد انوار اللہ بن المولوی شجاع الدین الحیدرآبادی۔

مولانا علیہ الرحمہ اپنے واقعات طالب علمی کے ضمن میں فرماتے تھے:۔

"ہم کوشش کرتے تھے کہ زیرِ درس کتابوں کے مضامین کسی صورت مطالعہ ہی میں حل ہو جائیں۔ طریقہ یہ تھا کہ پہلے عبارت و ترجمہ کی جانب توجہ کی جاتی۔ جو نئے الفاظ آتے تھے ان کو لغت کی مدد سے حل کیا جاتا۔ پھر مطلب کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی۔ اگر ایک دفعہ مضمون حل نہ ہوتا تو دوبارہ سہ بارہ سعی کی جاتی۔ اگر کوئی مضمون اتنا مشکل ہوتا جو سعی پیہم کے باوجود سمجھ میں نہ آتا تو دل میں خلش رہ جاتی۔ جب استاد کے سامنے سبق شروع ہوتا تو بجز چند شبہات کے جو مطالعہ میں حل نہ ہو سکے ہوں اور کوئی بات دریافت طلب نہ رہتی۔ یہی وجہ تھی کہ روزانہ کئی کئی صفحات درس ہوتا تھا۔ آپ فرمایا

کرتے تھے کہ اس وقت استاذ کی قدر و منزلت معلوم ہوتی تھی کہ جو مضمون گھنٹوں کی سعی میں حل نہ ہو سکا تھا استاذ نے ذرا سی دیر میں حل کر دیا اور فرطِ مسرت سے ایسا معلوم ہوتا کہ گویا استاذ کی بدولت ایک بیش بہا خزانہ مل گیا۔"

مولانا نے سلوک کی ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے پائی اور تمام سلاسل میں بیعت کر کے خلافت حاصل کی۔ سفر حجاز میں آپ نے پھر تجدید بیعت کی ہے۔

آپ کا عقد نکاح ۱۲۸۲ھ میں حاجی محمد امیر الدین صاحب محتسب بنولہ کی صاحبزادی سے ہوا۔ جن سے دو صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں ہوئیں۔ تفصیل آگے آئے گی اور ۱۲۸۵ھ میں محکمہ مالگزاری سرکار عالی میں خلاصہ نویسی کی خدمت پر مامور ہوئے۔ اس خدمت کو تقریباً ڈیڑھ سال انجام دینے کے بعد ۱۲۸۷ھ میں مستعفی ہو گئے۔ استعفا کا واقعہ بھی عجیب ہے جس سے آپ کا تقدس اور ورع ظاہر ہوتا ہے۔ ملازمت سرکاری جو عموماً عزت و وقعت اور خوش حالی کا واحد ذریعہ سمجھی جاتی ہے اس کو مولانا نے محض اس بنا پر چھوڑ دیا کہ آپ کے پاس ایک مثل خلاصہ نویسی کے لیے بھیجی گئی جو سودی لین دین سے متعلق تھی۔ مثل دیکھتے ہی وہ حدیث شریف پیش نظر ہو گئی جس میں سودی کاروبار کرنے، اس کا حساب و کتاب لکھنے اور اس کی شہادت دینے والوں کو وعید شدید بتلائی گئی ہے۔ افسر بالا نے آپ کی دیانت و کارگزاری کے پیش نظر استعفا منظور کرنے میں تامل کیا اور اطمینان دلایا اور وعدہ کیا کہ آئندہ ایسا کوئی کام آپ کے تفویض نہیں کیا جائے گا۔ مگر آپ یہ کہہ کر کہ جب تک آپ ہیں یہ رعایت کریں گے دوسروں سے یہ توقع نہیں۔ اس کے علاوہ جب ملازمت ہی ٹھہری تو حاکم کے حکم کو ماننا ہی پڑے گا۔ خدمت سے کنارہ کش ہو گئے درحالیکہ اس وقت آپ متاہل اور صاحب اولاد تھے۔ جب تک والد ماجد حیات تھے ترکِ ملازمت کی وجہ سے آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ تقریباً ایک ہی سال بعد ۱۲۸۸ھ میں والدِ ماجد علیہ الرحمہ نے سفر آخرت اختیار فرمایا۔ سایۂ پدری کا سر سے اُٹھ جانا ہی تھا کہ اس کی جگہ مصائب و آلام نے لی اور ملنے جلنے والے ترکِ ملازمت پر ملامت کرنے لگے مگر آپ ارشادِ خداوندی و من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا و یرزقہ من حیث لا یحتسب پر نظر رکھے ہوئے اپنے شغل درس و تدریس میں مشغول و منہمک ہو گئے۔ اس نازک وقت میں بھی آپ کے پائے صبر و استقلال میں لغزش نہ آنے پائی۔ اور بمصداق ان مع العسر یسرا وہ مرتبہ عظیم حاصل ہوا جس سے اچھی طرح تلافی مافات ہو گئی۔

مولانا کے رفقا میں حضرت غلام قادر مہاجر مدنی پہلے شخص ہیں جن کے دل میں آپ کے شغفِ علمی کو دیکھ کر ایک خالص مذہبی درسگاہ کے قیام کا خیال پیدا ہوا۔ اس کے بعد حضرت مولوی محمد مظفر الدین صاحب معلیٰ مددگار ناظم ثبہ نے اس بارے میں اپنے دوست احباب سے مشورہ کیا۔ باہم طے پایا کہ ایک مجلسِ عام

منعقد کرکے اس میں اس کے افتتاح کا مسئلہ پیش کیا جائے۔ مقصود یہ تھا کہ مولانا کا فیضان تدریس عام ہو اور یہ سلسلہ باضابطہ حیثیت سے جاری رہے۔ چنانچہ روز دوشنبہ ۱۹ ذی الحجۃ الحرام ۱۲۹۲ھ م ۹ اسفندار ۱۲۸۵ف کو حضرت معلی صاحب کے مکان میں ایک جلسۂ عام منعقد ہوا جس میں یہ تحریک پیش کی گئی کہ حیدرآباد جیسی اسلامی ریاست میں ایک ایسی مذہبی درسگاہ کی شدید ضرورت ہے جو دینیات کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کرے۔ مذہب کی طرف سے آج کل جو بے اعتنائی برتی جارہی ہے اگر چندے یہی حال رہے تو اندیشہ ہے کہ کہیں سارا ملک مذہب سے بیگانہ نہ ہوجائے۔" یہ تحریک باتفاق آرا منظور ہوئی اور علمائے کرام کی ایک بڑی جماعت نے خیال ظاہر کیا کہ مولوی انوار اللہ صاحب سے بہتر ہماری جماعت میں کوئی ایسی ہستی نظر نہیں آتی جو اس مدرسہ کی صدارت کو انجام دے سکے۔ اس طرح مولانا اس مدرسہ کے صدر مقرر ہوئے جو مدرسہ نظامیہ کے نام سے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام بلادِ اسلامیہ میں لازوال شہرت رکھتا ہے اور شائقین علم دین کو اقطارِ عالم سے کشاں کشاں حیدرآباد لاتا ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر آئندہ آئے گا۔ اس زمانے کی سالانہ روودادوں اور مطبوعہ کارروائیوں سے معلوم ہوسکتا ہے کہ بلادِ اسلامیہ عالم کے طالبانِ علوم دینیہ کس ذوق و شوق سے اپنے وطن مالوف کو چھوڑکر محض تشنگیٔ علم کو بجھانے کے لیے مدرسہ نظامیہ حیدرآباد آتے اور علوم دینیہ سے سیراب ہوکر وطن واپس ہوتے تھے۔ بعض اصحاب ایسے بھی ملیں گے جنھوں نے تحصیل علم کے بعد وطن واپس جانے کا خیال ترک کردیا اور حیدرآباد ہی کے ہو رہے۔

اس درس گاہِ دینی کا نام مدرسہ نظامیہ اس لیے تجویز ہوا کہ اس میں ملا نظام الدین فرنگی محلی کے تجویز فرمودہ نصاب کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے جو درس نظامی کے نام سے بلادِ ہند میں مشہور اور رائج ہے۔ نیز یہ مدرسہ مدرسۂ نظامیہ بغداد کی یاد تازہ کرنے والا ہے جس سے امام غزالی جیسے نامی گرامی علما فیض یاب ہوئے۔ نیز اس کا محلِ وقوع سلطنتِ اسلامیہ نظامیہ آصفیہ ہے۔

ترکِ ملازمت خصوصاً والدِ ماجد کی وفات حسرت آیات کے بعد عرصہ تک مولانا متوکلانہ زندگی بسر فرماتے رہے۔ قیامِ مدرسہ نظامیہ کے بعد بھی مدرسہ سے آپ کی کوئی مستقل آمدنی نہ تھی۔ کیونکہ خود مدرسہ کے اخراجات ہی قومی چندوں سے چلتے تھے۔ اساتذہ کی تنخواہوں اور دیگر ضروریات کی تکمیل کے بعد اگر کچھ پس انداز ہوتا تو آپ کے مکان میں بھیج دیا جاتا تھا۔ اسی اثنا میں آپ کو حرمین شریفین کی زیارت کا خیال ہوا۔ چنانچہ ۱۲۹۴ھ میں آپ نے سفر حجاز کا عزم فرمایا۔ اور اعزہ و احباب کی کثیر جماعت کے ساتھ بہ حکم واذا عزمت فتوکل علی اللہ۔ توکلت علی اللہ کہتے ہوئے چل کھڑے ہوئے۔ اسی سفر میں آپ نے شیخ الوقت فانی فی اللہ باقی باللہ حضرت مولانا حافظ حاجی امداد اللہ شاہ صاحب مہاجر مکی سے جو بلادِ مقدسہ عرب میں بڑے زبردست روحانی مقتدا تسلیم کیے جاتے تھے تمام سلاسل میں مکرر بیعت کرکے منازل سلوک کی تکمیل کی۔ اور بعد بھی جب کبھی مکہ مکرمہ میں حاضری نصیب ہوتی تو فیضِ صحبت سے مستفید ہوتے رہے اور

حضرتِ محترم نے آپ کے کمالاتِ ظاہری و باطنی کو ملاحظہ فرما کر بلا طلب خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور دکن کے مُریدین کو تکمیل سلوک و حل مشکلات میں مولانا سے رجوع کرنے اور مدد لینے کی ہدایت فرمائی۔

سفر سے واپس آنے کے بعد بھی معاشی مصائب و آلام کا وہی حال رہا مگر آپ نہایت جرأت و استقلال سے مردانہ واران کا مقابلہ فرماتے رہے اور علمی مشاغل درس و تدریس میں فرق آنے نہیں دیا تا آنکہ ابتلا و امتحان کا دَور بفضلہ تعالیٰ ختم ہوا جس کی تفصیل یہ ہے:۔

۶ ذیحجہ ۱۲۹۲ھ روزِ سہ شنبہ کو حضرت مولانا محمد زماں خاں شاہجہاں پوری استاذ اعلیحضرت نواب افضل الدولہ بہادر و اعلیحضرت نواب میر محبوب علی خاں نے شہادت پائی۔ اور آپ کی جگہ آپ کے بھائی حضرت مولانا مسیح الزماں خاں، اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں بہادر کی تعلیم پر مقرر ہوئے تھے۔ لیکن تعلیم کے علاوہ مولانا مسیح الزماں خاں سے اور بھی سرکاری خدمات متعلق ہوئے۔ جس کے باعث موصوف نے محسوس کیا کہ کثرتِ مشاغل کی وجہ سے تعلیم متاثر ہو رہی ہے اس لیے نائب الرئیس امیر کبیر نواب رشید الدین خاں صاحب والی پائیگاہ، اور نواب مختار الملک سر سالار جنگ اول مدار المہام وقت سے استمزاج کر کے اعلیحضرت کی تعلیم کے لیے مولانا محمد انوار اللہ صاحب اور مولانا سید اشرف حسین صاحب سہسرامی کا انتخاب کیا اور دربار سے اس کی منظوری حاصل کر لی گئی۔ یہ تمام مراتب کارروائی طے کر لئے گئے مگر مولانا کو نہ اس کی خبر ہونے پائی اور نہ آپ کی مرضی دریافت کی گئی۔ بعد صدورِ منظوری جب آپ کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپ نے فرمایا کہ میں قومی خدمت کو ترک کر کے اس کو قبول نہیں کر سکتا اس پر مولانا مسیح الزماں خاں نے فرمایا کہ میں اس اطمینان پر کہ آپ قبول فرمائیں گے دربار سے منظوری حاصل کر لی ہے اگر آپ انکار فرمائیں گے تو مجھے خفیف ہونا پڑے گا۔ بالآخر مولانا موصوف اور معلی صاحب کے بیحد اصرار پر آپ نے فرمایا کہ میں جب تک استخارہ نہ کر لوں کوئی قطعی جواب نہیں دے سکتا۔

استخارہ کرنے پر آپ نے خواب دیکھا کہ کچھ کاغذات لئے ہوئے دربار میں جا رہے ہیں اس کو اجازت تصور کر کے رضامندی ظاہر کر دی۔ اس طرح اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں کی تعلیم آپ کے تفویض ہوئی۔ جس کا سلسلہ کئی سال تک یعنی ۱۳۰۱ھ تک جاری رہا اور اس کے صلہ میں آپ کو چار سو روپیہ ماہوار خزانہ صرف خاص مبارک سے تاحیات ملتے رہے۔ مگر اس کے بعد بھی آپ نے قومی خدمت کا سلسلہ منقطع نہیں کیا بلکہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف برابر جاری رکھی۔

یہ بات اظہر من الشمس و ابین من الامس ہے کہ حضور پُر نور نواب میر محبوب علی خاں کی ولادت باسعادت ۵ ربیع الآخر ۱۲۸۳ھ میں واقع ہوئی تھی جو چراغ دکھن (۱۲۸۳ھ) سے ہویدا ہے۔ اور حضور نواب افضل الدولہ بہادر کی وفات حسرت آیات رمضانِ شریف ۱۲۸۵ھ میں ہوئی۔ افضل الدولہ راح الجنۃ (۱۲۸۵ھ)۔

مصرعۂ تاریخ رحلت ہے۔ اس طرح ارھائی سال کی عمر میں حضور محبوب السلاطین سریر آرائے سلطنت دکن ہوئے تھے۔ محرم سنہ ۱۳۰۰ھ میں مدارالمہام وقت نواب مختارالملک فوت ہوئے تو حضور پُرنور سن بلوغ کو پہنچ چکے تھے اس لیے سنہ ۱۳۰۱ھ میں قانونی عمر ۱۸ سال تکمیل پانے پر رسمی تخت نشینی کے علاوہ حقیقی تخت نشینی عمل میں آئی اور جشن تخت نشینی کے موقع پر سنہ ۱۳۰۲ھ میں مولانا کو "خان بہادر" کے خطاب اور منصب یکہزاری سے سرفراز فرمایا گیا۔ حضور پُرنور نے زمام سلطنت اپنے دستِ مبارک میں لی۔ نائب الرئیس کی خدمت برخاست ہوئی۔ اور سلسلۂ تعلیم بھی ختم ہوا۔ حضور پُرنور مولانا کی بہت عزت و تکریم فرماتے اور اعترافِ خدمت کے طور پر اکثر فرمایا کرتے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد ہم نے جو کچھ سیکھا وہ مولانا انوار اللہ خاں صاحب سے سیکھا۔

نظم

حضرت شیخ الاسلام عارف باللہ مولانا محمد انوار اللہ فاروقی نور اللہ مرقدہٗ

اے آنکہ برون و ہم درونی
بے پردہ برخ نقاب چونی

پیدا پنہاں تو نیست لیکن
بے چون ہستی و بے چگونی

نازم بفسونِ تو کہ از ما
با عینِ ظہور در کمونی

حیران ماندم ز اصطلاحات
بے سو سو یت کہ رہنمونی

آنسو جستہ بہ جستجو یت
کردہ نگہم ببے حرونی

پیش تو خیال ما چہ باشد
کز وہم و خیال ہم بردنی

منک و بک اعوذ یا رب
فالخلق لما تیز احمونی

مشکل گویم و گر نہ گویم
یارب چہ کنم بدین زبونی

و تطلب حیلۃ لقتلی
قلبی یھویک فاقتلونی

انور رہ وصل یار جوئی
فرزانہ یا کہ در جنونی

ادبیات

حمد باری تعالیٰ

حضرت مولانا سید شیخن احمد صاحب
قادری شطاری کامل

ہر دل میں اک انوکھا دیکھا مقام تیرا　　دُنیا بدل بدل کر لیتی ہے نام تیرا
سب کی نظر ہے تجھ پر سب پر نظر ہے تیری　　سب کو محیط دیکھا احسانِ عام تیرا
تیری ربوبیت کی ہے شان ہی نرالی　　مِلتا ہے سب کو صدقہ بالالتزام تیرا
توحید کی نشہ میں رہتا ہے مست و بیخود　　وہ خوش نصیب جس کو مِلتا ہے جام تیرا
پوشیدہ ہوں کہ ظاہر ہیں جس قدر عوالم　　اک اقتدار سب پر ہے لاکلام تیرا
ہر سر کو تیرے آگے جھکتا ہوا ہی دیکھا　　گویا سرشت ہی میں ہے احترام تیرا
صورت گری ہو اس کی چاہے کسی بھی صورت　　رکھتے تو ہیں تصور سب خاص و عام تیرا
یہ کائنات ساری ہوتی ہے رام اس کی　　جو کوئی بالارادہ ہوتا ہے رام تیرا
انساں کی فکر چاہے پہلو ہزار بدلے　　بدلا نہ جا سکے گا لیکن نظام تیرا
منکر بھی مشکلوں میں تجھ کو پکارتے ہیں　　بے ساختہ زباں پر آتا ہے نام تیرا
میرا فریضہ تیری رحمت سے استفادہ　　اور میری عیب پوشی ہر وقت کام تیرا
مجھ سے معاملہ کر شایانِ شاں تو اپنے　　ہے اک مقام میرا اور اک مقام تیرا
ہم دل کی دھڑکنوں کو سمجھے تو بس یہ سمجھے　　کھٹکا لگا ہوا ہے اس کو مدام تیرا
یہ ماہ و مہر و انجم گردش میں یوں ہی کب ہیں　　صدقہ اُتر رہا ہے ہر صبح و شام تیرا

یہ اس کے فضل کی ہے ساری کرشمہ سازی
مقبول ہے جو سب میں کامل کلام تیرا

نظم

محمد انصار علی قریشی
جاوید

غریب و ناتواں ہو کر نہ سردارِ زماں ہو کر
گرا ہے حضرتِ انساں طلبگارِ جہاں ہو کر

طبیعت لاکھ مانوسِ قفس ہوتی رہے ہمدم
مگر یادِ چمن آجائے گی آزادِ جہاں ہو کر

خیالِ یادِ ماضی میں مرا سوزِ نہاں ابھرا
کبھی دل کا دھواں بن کر کبھی زارِ رواں ہو کر

مری اندوہِ ہستی کا یہ عالم ہے معاذ اللہ
تلاشِ آدمیت بھی رہی بارِ گراں ہو کر

کہیں کمزور آہوں میں سسکتی آدمیت جو
غضب کا رنگ لائی ہے بہارِ بیکراں ہو کر

ہوئیں ناکام ساری کاوشیں اس دارِ فانی میں
مریضِ غم چلا آخر کو بیزارِ جہاں ہو کر

چڑھیں گے پھول تربت پہ غمِ جاوید کے مرنے
رہے گا آخرش ہر بار بارِ جاوداں ہو کر

رحمت بخاری (نظامیہ)

(۱)

محسنِ اعلیٰ حسنِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم
رحمتِ یزداں رہبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم

دُنیا میں اک حشر بپا تھا انساں کا انسان خدا تھا
پتھر بھی پُوجے جاتے تھے پتھر سا بے جان خدا تھا
ہوتی تھی ابلیس کی پوجا یعنی کہ شیطان خدا تھا
آپ کا ہے ممنون یہ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

آج بھی برپا اک محشر ہے مقصدِ ہستی سیم و زر ہے
ہم بندے ہیں آج غرض کے خود غرضی ہی پیشِ نظر ہے
پاس نہیں ہے کچھ مذہب کا غیر کی سیرت وجہِ مفر ہے
غیر کی چوکھٹ پر ہے جبیں خم صلی اللہ علیہ وسلم

ٹھوکریں ہیں ہم دنیا کی آج ہمارا نام بُرا ہے!!!
بھٹک رہے ہیں ہم ظلمت میں سسک رہے ہیں کام بُرا ہے
کوشش کا آغاز غلط ہے محنت کا انجام بُرا ہے
نظرِ کرم ہو غیر نہیں ہم صلی اللہ علیہ وسلم

(۲)

مقصود اگر ہو امن و اماں اسلام کا پرچم لہرا دو
اس دَور کے انسانوں کو پھر جینے کا سلیقہ سکھلا دو

بتلاؤ تو غیر کی چوکھٹ پر
مُسلم کی جبیں خم ہے کیونکر
کیوں مقصدِ ہستی ہے سیم و زر
ہے آج پریشاں نوعِ بشر
مومن کی حیات و موت ہے کیا
اک بار انہیں پھر دِکھلا دو
اِس دَور کے انسانوں کو پھر جینے کا سلیقہ سکھلا دو

ہے وجہِ مفر غیروں کا چلن
باطل کی سیاست ہے پُر فن
غفلت میں نہ رہ انجان نہ بن
ہے بھیس میں رہبر کے رہزن
بھٹکی ہوئی نوعِ آدم کو
سچائی کا رستہ بتلا دو
اِس دَور کے انسانوں کو پھر جینے کا سلیقہ سکھلا دو
مقصود اگر ہو امن و اماں اِسلام کا پرچم لہرا دو

رُباعی (۳)

ہم سے منزل جو دُور ہے ساقی اس میں کِس کا قصور ہے ساقی
بات میں صاف صاف بتلادوں نیتوں کا فتور ہے ساقی

قطعات

خودکشی عِصمت فروشی رہزنی فاقہ کشی آج کیا کیا ہو رہا ہے زندگی کے واسطے
کچھ نہیں ہے گھُپ اندھیرے کے سوا اس دَور میں دل بھٹکتا پھر رہا ہے روشنی کے واسطے

دَم بھر تعیشات سے فرصت نہیں جنھیں وہ کر رہے ہیں آج غمِ دوجہاں کی بات
نا اہلیت راہبری کا کھُلا ثبوت غارت گری کے کام یہ امن و اماں کی بات

(فرد)

اُنس و اخلاص عام ہونے دو اجنبیّت حرام ہونے دو

صلہ (۴)

بھوک فاقہ مفلسی آنسو محنت کا ثمر
جسمِ عُریاں کی نمائش کا صلہ ہے سیم و زر
عشوۂ و ناز و ادا عِصمت فروشی عام ہے
سوگئی ہے اب شرافت ذِلتوں کا دام ہے
قدرِ اہلِ فن نہیں اہلِ ہُنر کا مول ہے
آج ہر فنکار کا ایمان ڈانوا ڈول ہے
چند سِکوں کے عوض فنکار بکتا ہے یہاں
اور محنت کش سرِ بازار بکتا ہے یہاں

ہمارا ترانہ

ڈاکٹر صوفی افسر الحق دہلوی
استاذ جامعہ نظامیہ

قایم رہے الٰہی یہ مدرسہ ہمارا
اسلامیت کا مرکز ہے جامعہ ہمارا

مشفق اساتذہ ہیں شاگرد ہیں مؤدب
ہوتا ہے طے بخوبی ہر مرحلہ ہمارا

درسِ حدیث و فقہ مقصود و مدعا ہے
تحصیلِ علمِ قرآں ہے مشغلہ ہمارا

سب مانتے ہیں لوہا تعلیم کا ہماری
دُنیا کے جامعوں میں ہے تذکرہ ہمارا

توحید کی اشاعت تفویض ہے ہمارے
تکذیبِ کفر و باطل ہے ضابطہ ہمارا

اللہ نے بنایا ہے ہم کو خیرِ امت
سردارِ انبیا سے ہے سلسلہ ہمارا

آگے قدم بڑھا کر ہٹتے نہیں ہیں پیچھے
عالم پہ آشکارا ہے حوصلہ ہمارا

افسر کی یہ دعا ہے خلاقِ دو جہاں سے
اونچا رہے جہاں میں یہ جامعہ ہمارا

پُرنور کر کے لوٹا حق کی تجلیوں سے
ظلمت کدے میں پہنچا جب قافلہ ہمارا

نامِ خدا کا سکہ جاری کیا زمیں پر
ہے یاد آسماں کو ہر معرکہ ہمارا

انصاف و عدل پر ہے قایم ہمارا مذہب
اغیار مانتے ہیں ہر فیصلہ ہمارا

ہم کو نہیں تنفر ہم میں نہیں تعصب
ہر قوم سے مساوی ہے رابطہ ہمارا

پائے گا اک ہمیں کو امن و اماں کا حامی
لے صدق دل سے کوئی گر جائزہ ہمارا

حق کے لیے جئیں گے حق ہی پہ مر مٹیں گے
حق ہی عطا کرے گا ہم کو صلہ ہمارا

اسلام نے بنایا ہے ہم کو بھائی بھائی
حل اتحاد پہ ہے ہر مسئلہ ہمارا

قایم رہے دکن میں یہ جامعہ ہمارا
تعلیم گہ یہی ہے اسلامیہ ہمارا

ہو علم دیں کا منبع قایم سدا ہمارا
ہے آرزو ہماری اور مدعا ہمارا

اللہ کو جانتے ہیں اللہ کو مانتے ہیں
ہم ہیں خدا کے بندے اور ہے خدا ہمارا

اللہ کے جو نبی ہیں محبوب ہیں ہمارے
حبِ محمدی ہے شیوہ سدا ہمارا

ابراہیمؑ اور اسحاقؑ اسمٰعیلؑ اور یوسفؑ
یحییٰؑ نبی ہمارے اور زکریاؑ ہمارا

آدمؑ و نوحؑ و عیسیٰؑ ادریسؑ اور موسیٰؑ
سارے پیمبروں سے ہے سلسلہ ہمارا

داؤدؑ اور سلیماںؑ ایوبؑ ہوں کہ یونسؑ
صدر الصدور سب کا ہے مصطفیٰ ہمارا

بوبکرؓ اور عمرؓ کا عثمانؓ اور علیؓ کا
خلفائے راشدیں کا ہے میکدہ ہمارا

قایم رہے دکن میں یہ جامعہ ہمارا
تعلیم گہ یہی ہے اسلامیہ ہمارا

شانِ نظامیہ

مولانا حکیم سید عثمان حسینی قادری ذکی
(فاضل نظامیہ)

اے مکتبِ نظامیہ۔ دولت سرائے علم　　تیری ہی ذات سے ہوئی نشو و نمائے علم
اکثر ملے یہیں سے دُرِ بے بہائے علم　　تو ہے ہمارے واسطے ہم ہیں برائے علم
تجھ سے ہی نام ہے عربیہ علوم کا
تجھ پر اثر نہ ہو کبھی بادِ سموم کا

ہیں یوں تو اور سیکڑوں ہی مدرسے یہاں　　سب کارواں ہیں اور ہے تو میر کارواں
انوارِ علم سے ہے فضیلت تری عیاں　　قایم رکھے خدا تجھے تا دورِ آسماں
ترجیح سب پہ ہے تجھے ہر اعتبار سے
ہے فیض تجھ کو رحمت پروردگار سے

آزادِ دیں جو ہیں وہ ترے پائے بند ہیں　　عالم نوازیاں تری سب کو پسند ہیں
میں کیا بتاؤں جو ترے رُتبے بلند ہیں　　کیسے بڑے بڑے ترے احسان مند ہیں
کتنوں کو تو نے عالم و فاضل بنادیا
ناقص کوئی جو آگیا کامل بنادیا

تعلیم تیری رہبرِ دیں رہ نمائے دیں　　تیرا نصاب خاص سخن آشنائے دیں
مسلک ترا موافق ہر مدعائے دیں　　شاداب تجھ سے ہے چمنِ دلکشائے دیں
کیا فیض بخش و فیض رساں ہے ترا وجود
ہو روز افزوں نام ترا اور تری نمود

تو کیا پسند آئے انھیں جو ہیں خود پسند　　تو بھی بلند اور تری تعلیم بھی بلند
نادان آئے اور گئے بن کے ہوشمند　　ہے یہ دُعا کہ تیرا درِ فیض ہو نہ بند
شکرِ خدا ذکی کو بھی مسرور کردیا
دامانِ علم گوہرِ مقصد سے بھر دیا

احوالِ جامعہ

جامعہ نظامیہ حیدرآباد علوم عربیہ دینیہ کی اعلیٰ تعلیمی درسگاہ ہے۔ کم و بیش ایک صدی سے اس سرچشمۂ علمی سے ہزاروں طالبانِ علم فیض یاب ہوئے اور آج بھی بحمد اللہ ملک اور بیرونِ ملک میں اس کا فیض جاری ہے۔ یوں تو ہر زمانہ میں علمِ دین کی ضرورت رہی ہے لیکن موجودہ دور میں اس کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے اور بالخصوص جس ملک میں ہم رہتے اور بستے ہیں دینی تعلیم کی اور بھی شدید ضرورت ہے تاکہ ہماری نئی نسل علمِ دین سے آراستہ ہو کر اسلامی فہم و فکر، کردار و سیرت کی حامل بنے، شعارِ اسلامی اور اسلامی تہذیب کی حفاظت کر سکے۔ ماسویٰ اس کے ایسے علمائے باعمل پیدا ہوں جو اسلامی علوم و فنون میں اختصاص و امتیاز اور بصیرت و دستگاہ رکھتے ہوں تاکہ ان سے ملتِ اسلامیہ کی صحیح رہنمائی کا فریضہ انجام پا سکے۔ یہ امر کسی مزید وضاحت کا محتاج نہیں کہ دین میں اعلیٰ درجہ کا تفقہ، تبحر علمی اور بصیرت دینی کا حصول اسلامی علوم و فنون میں "اعلیٰ تعلیم" کی تحصیل اور اہتمام ہی سے ممکن ہے۔ چنانچہ اسی بلند مقصد کے لیے دینی درس گاہوں کا قیام عمل میں آیا اور اسی کے لیے وہ صدیوں سے مصروف و سرگرمِ عمل ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ملک کی تقسیم کے بعد مسلمانانِ ہند کو گوناگوں مصائب و مشکلات سے دوچار ہونا پڑا جس کا اثر جامعہ نظامیہ پر بھی پڑنا یقینی اور ناگزیر تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جامعہ نظامیہ حکومتی امداد اور شاہی سرپرستی میں چلتی رہی۔ دیگر دینی جامعات اور درس گاہوں کی طرح یہ جامعہ بھی اول روز سے قومی بنیادوں پر قائم اور جاری رہتی تو اس کو یہ انحطاط کی صورت نہ دیکھنی پڑتی۔ چنانچہ بیس سال کے اس طویل عرصہ میں جامعہ نے کئی نشیب و فراز دیکھے، مصائب آئے اور ٹلتے رہے لیکن اس کے عزم سفر میں فرق نہیں آیا۔ اب گزشتہ چند ایک سال سے جامعہ کو قومی بنیادوں پر مضبوط و مستحکم کرنے اور خود کفیل بنانے کی کوشش جاری ہے جس کے نتائج ہمت افزا ہے۔ سالِ حال طلبائے قدیم، اساتذہ جامعہ، مخیر تجار اور ہمدردانِ جامعہ کی سعی بلیغ سے سنینِ ماضیہ کی بہ نسبت سہ چند عطایا وصول ہوئے اور ماہانہ چندے بھی جاری ہیں گو کہ یہ آمدنی غیر متوالی ہے مگر اس سے جامعہ کو بڑی مدد ملی جس سے جامعہ اس قابل بنا کہ تقریباً بیس ہزار کے قرض کی ادائی ہو گئی۔ اساتذہ و ملازمین جامعہ کے قلیل مشاہروں اور بڑھتی ہوئی گرانی کے پیشِ نظر ان کی تنخواہوں میں اضافہ کیا گیا اور مقیم طلبہ کی تعداد میں بیس کا اضافہ کیا جا کر ان کی تعداد (۱۰۰) تک بڑھا دی گئی و نیز طلبہ کے لیے ترغیبی و تعلیمی انعامات وغیرہ کی بھی گنجائش رکھی گئی اور بحمد اللہ تعالیٰ اس سال کا موازنہ بچت پر مشتمل ہے۔

۱۔ نصابِ تعلیم | جامعہ کا نصابِ تعلیم دو شعبوں، شعبۂ مکتب اور شعبۂ اعلیٰ تعلیم پر مشتمل ہے۔

(ا) شعبۂ مکتب:۔ یہ شعبہ اول تا ہشتم آٹھ سالہ نصاب تعلیم پر مرتب ہے جس میں جملہ مبادیات کے علاوہ بقدرِ ضرورت انگریزی، جنرل سائنس وریاضی اور تاریخ وجغرافیہ کی بھی تعلیم دی جاتی ہے اور طالب علم میں اتنی علمی استعداد پیدا کی جاتی ہے کہ وہ آسانی سے اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں چل سکے۔

(ب) شعبۂ اعلیٰ تعلیم:۔ اس شعبہ کی مدت تعلیم بھی آٹھ سالہ ہے جس میں علوم عربیہ دینیہ تفسیر، حدیث، فقہ، ان کے اصول، عقائد و کلام، فرائض ومناظرہ، ادب عربی، صرف ونحو، معانی وبیان، عروض وقافیہ، منطق وفلسفہ اور سیرت وتاریخ کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہے۔ اس شعبہ کے حسب ذیل چار درجے اور امتحانات ہیں اور ہر درجہ وامتحان کا نصاب دو سالہ ہے:۔

مولوی ۔ عالم ۔ فاضل ۔ کامل

درجہ کامل میں طالب علم کو تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، ادب اور تاریخ کے مضامین میں سے کسی ایک کو اپنا تعلیمی مضمون منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ جامعہ عثمانیہ نے جامعہ نظامیہ کے امتحانات کو اپنے عربی امتحانات انٹرنس۔ ڈپ۔ او۔ یل اور بی۔ او۔ یل کے مماثل تسلیم کیا ہے اور فاضل کامیاب طلبہ کو بی۔ اے کے انگریزی کے پرچے دینے کی اجازت بھی دے دی گئی ہے۔

۲۔ شعبۂ حفظ وتجوید اس شعبہ میں ۴ سال کی مدت میں حفظِ قرآن کی تکمیل کرائی جاتی اور ساتھ ہی حفظہ کو تجوید کی تعلیم بھی دی جاتی ہے اور انھیں ضروری مسائل فقہ سے بھی واقف کرایا جاتا ہے۔

۳۔ امتحانات (۱) جامعہ میں ابتدا تا انتہا تعلیم کا منظم انتظام ہے۔ سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحانات باقاعدگی کے ساتھ منعقد کئے جاتے ہیں اور سندی امتحانات میں کامیاب طلبہ کو درجہ وار اسناد دیئے جاتے ہیں۔

(۲) اہلِ خدمات شرعیہ، قاضی صاحبان، ائمہ ومؤذنین اور قرأت کے امتحانات بھی ہر سال منعقد کئے جاتے ہیں جن میں طلبہ کی ایک کثیر تعداد شریک ہوتی ہے۔

(۳) جامعہ سے ایک شعبۂ طبی کالج کا الحاق ہے۔ جامعہ کے زیرِ نگرانی ہر سال کامل الطب کا امتحان منعقد کیا جاتا اور کامیاب طلبہ کو جامعہ کی جانب سے اسناد دیئے جاتے ہیں۔

۴۔ دارالافتا جامعہ میں قدیم سے ایک دارالافتا قائم ہے۔ تمام دینی مسائل میں مسلمانوں کی رہنمائی کی جاتی ہے۔ یہاں کے فتوے ملک کی عدالتوں میں مستند ومعتبر مانے جاتے ہیں۔

۵۔ دارالتقریر طلبہ کو تقریر کی مشق کرانے کے لیے ایک دارالتقریر قایم کیا گیا ہے جس میں ہر ہفتہ علمی ودینی موضوعات پر طلبہ کو تقریر کرائی جاتی ہے اور ہر سال سالانہ تقریری مقابلے منعقد کئے جاکر ممتاز مقرر طلبہ کو انعامات دیئے جاتے ہیں۔ اس سال ماہ ربیع الاول میں منعقدہ

تقریری مقابلے میں مولوی ثناء اللہ متعلم فاضل اور مولوی بشیر محی الدین متعلم کامل اور مولوی عبدالرحیم خان متعلم کامل کو بالترتیب انعام اول، دوم وسوم کا مستحق قرار دیا گیا۔ مولانا حکیم محمد حسین صاحب شیخ الحدیث کی جانب سے انعامات تقسیم کئے گئے۔

۶۔ کتب خانہ جامعہ کا ایک قیمتی کتب خانہ ہے جس میں تمام علوم وفنون اور ادب وغیرہ پر عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں درسی اور غیر درسی ہزاروں کتب موجود ہیں۔ اس میں عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کا ایک قیمتی ذخیرہ ہے۔ درسیات کا ایک الگ حصہ ہے جس سے طلبہ کو درسی کتب مستعار دیے جاتے ہیں۔

۷۔ دارالمطالعہ کتب خانہ میں ایک ہال میں الگ سے دارالمطالعہ ہے جس میں قدیم وجدید کتب کے علاوہ اردو وعربی اخبارات ورسائل مہیا کئے گئے ہیں۔ اقامتی طلبہ صبح، تا ۹ اور شام ½۴ تا مغرب مطالعہ کرتے ہیں۔ طلبہ کو مطالعہ کے لئے عارضی مدت کے لیے کتب خانہ اور دارالمطالعہ سے کتابیں بھی دی جاتی ہیں۔ اساتذہ صاحبین بھی اس کتب خانہ سے استفادہ فرماتے ہیں۔

۸۔ دارالاقامہ طلبہ کی رہائش کے لیے اندرون احاطہ جامعہ ایک وسیع اور سہولت بخش دارالاقامہ ہے جس میں رہائش کی جملہ سہولتیں موجود ومہیا ہیں۔ طلبہ کی نگرانی کے لیے دارالاقامہ میں ایک مودب مقیم رہتے ہیں۔ مغرب تا عشاء شبینہ ہوتا ہے وہ اس کی نگرانی کرتے اور طلبہ کی حاضری رکھتے ہیں اور ہر روز شیخ الجامعہ کو دارالاقامہ کی یومیہ رپورٹ دیتے ہیں۔

۹۔ دواخانہ دارالاقامہ میں طلبہ کی صحت کی دیکھ بھال اور علاج امراض کے لیے قدیم سے دواخانہ قایم ہے جس کے نگران وطبیب مولانا حکیم محمد حسین صاحب شیخ الحدیث ہیں۔ مولانا کافی ہمدردی وتوجہ سے طلبہ کا علاج فرماتے اور ان کی صحت کا ہر وقت خیال رکھتے ہیں۔

۱۰۔ مطبخ حدود جامعہ میں ایک بڑا مطبخ ہے صبح وشام پخت کا انتظام ایک داروغہ مطبخ کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ صبح (۹) اور شام (۴) بجے طلبہ کے لیے دسترخوان تیار کر دیا جاتا ہے۔ بیمار طلبہ کے لیے پرہیزی کا بھی انتظام رہتا ہے۔ تیمار دار کے ذریعہ ان کے حجروں میں ان کا کھانا اور پرہیزی بھیج دی جاتی ہے۔

---

۳۰ جمادی الاول ۱۳۸۸ھ کو حسب معمول مؤسس جامعہ نظامیہؒ کی فاتحہ سالانہ اور جلسہ تقسیم اسناد منعقد کیا گیا جس میں علماء نے شیخ الاسلام حضرت مولانا حافظ انوار اللہ خاں علیہ الرحمہ کے مجاہدانہ کارناموں اور ان کے علمی اور اصلاحی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ کامل التفسیر کے ایک طالب علم مولوی عبداللہ قرموشی نے بڑی اچھی علمی تقریر کی جس کو بیحد پسند کیا گیا۔ کامل، فاضل، عالم، مولوی، کامل الطب، قرأت وقضاءت اور امامت کے امتحانات منعقدہ ۱۳۸۷ھ میں کامیاب طلبہ کو جناب

صدر نشین صاحب مجلس انتظامی جامعہ نے اسناد تقسیم کئے عطاء اسناد سے قبل جناب صدر نشین نے اسناد حاصل کرنے والے طلبہ کو ان پر عائد ہونے والے فرائض و ذمہ داریوں کو یاد دلایا اور ان سے عہدہ برآ ہونے کا طلبہ سے عہد و اقرار لیا۔ علم اور دین کی خدمت کرنے اور تقویٰ اختیار کرنے کی انھیں تلقین کی۔ ڈاکٹر صوفی اسرار الحق صاحب استاذ جامعہ کی نظم "ہمارا ترانہ" کو طلبہ نے سُنایا جو نہایت ہی موثر تھا جس کا اول و آخر شعر یہ ہے:

قائم رہے الٰہی یہ جامعہ ہمارا　　اِسلامیت کا مرکز ہے جامعہ ہمارا

افسرؔ کی یہ دُعا ہے خلّاقِ دو جہاں سے　　او نچا رہے جہاں میں یہ جامعہ ہمارا

۱۲۹۲ھ ہجری وہ مبارک سال ہے جس میں جامعہ نظامیہ کی بُنیاد رکھی گئی۔ اب اس کو اپنی ایک صدی مکمل کرنے کے لیے صرف چار ایک سال باقی رہ گئے ہیں جس کے ختم پر جشن صد سالہ منایا جانا ہمارے پیش نظر ہے۔ اس سلسلے میں طلبائے قدیم، مخلصین اور ہمدردانِ جامعہ کے کئی ایک تحریکات ہیں مگر ہم اس جشن کے منانے میں اسی وقت حق بجانب ہوں گے جبکہ ہم اپنی مسلسل جدو جہد و سخت محنت سے ۱۳۹۲ھ تک جامعہ کو خود کفیل و خود مکتفی بنا دیں اور اس کی علمی افادیت اور دور دور تک پھیل جائے۔ اس سلسلے میں ایک چار سالہ جامع اسکیم اور ہر سال کا لائحہ عمل مرتب کیا جا رہا ہے۔ اس منصوبے کا نصب العین اور اس کی واحد غرض جامعہ کا مالی استحکام اور اس کا علمی ارتقاء ہے۔ ان دو بنیادی مقاصد کی تکمیل و حصول کے لیے ایک مستقل مجلس فراہمی سرمایہ اور ایک مجلسِ علمی کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے۔

۱۔ **مجلس فراہمی سرمایہ**:۔ یہ مجلس جامعہ کے لیے سرمایہ فراہم کرے گی اور ایسے ذرائع و تدابیر اختیار کرے گی کہ جس سے جامعہ اس چار سالہ مدت میں توسیع امکنہ اور مستقل وسائل یعنی املاک و جائداد کی صورت میں ہمیشہ کے لیے خود مکتفی ہو جائے۔

۲۔ **مجلسِ علمی**:۔ (۱) مجلسِ علمی کا یہ کام ہوگا کہ وہ نظامِ تعلیم میں کچھ ایسے خوش گوار تبدیلیاں لائے جس سے جامعہ کا علمی معیار بلند تر ہو جائے۔

(۲) اساتذہ جامعہ و فارغین علماء کے مرتبہ علمی و تحقیقی مقالے، تالیفات و تصنیفات اور عربی، فارسی اور اردو نایاب و نادر مخطوطات علمیہ کی بعد تصحیح و تحقیق، طباعت اور نشر و اشاعت کا اہتمام کرے اور اسی طرح ایک ماہوار علمی و دینی رسالے کی اشاعت عمل میں لائے۔

(۳) مدارسِ دینیہ عربیہ کے لیے ایک عام نصاب اور ان کے الحاق کے قواعد و شرائط مرتب و مدون کرے تاکہ ایک بہتر نظم و نسق کے تحت یکسانیت و سہولت کے ساتھ یہ دینی مدارس اپنے مقصدِ قیام

کو پورا کر سکیں۔

مختصر یہ کہ ان اہم مقاصد میں کامیابی کا تمام تر انحصار ہماری اپنی ہمت، پیہم جد و جہد اور اہل خیر حضرات و صحافت کے زیادہ سے زیادہ تعاون پر ہے۔ اگر ہم آنے والے قیمتی سالوں کو اسی لیت و لعل میں گزار دیں اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں تو یہ وقت کی بہت بڑی بھول ہوگی، مستقبل اس کی تلافی کرنے سے قاصر رہے گا اور اس صورتِ حال میں ہمارا جامعہ کا جشنِ صد سالہ منانا ایک بے معنی بات ہوگی۔

ضرورت ہے کہ علماء، واکابرین اور خاص طور سے طلبائے قدیم و ہمدردانِ جامعہ اس چار سالہ اسکیم پر غور فرمائیں اور بیک فکر و نظر و طریقۂ کار اس کو بروئے کار لانے کی ابھی سے جد و جہد کا آغاز کر دیں تو یہی بالآخر ہمارے حقیقی جشن کا باعث بنے گی۔ غرض ان مطلوبہ نتائج کو برآمد کرنے کے بعد ہی ہم ایک مہتم بالشان جشنِ صد سالہ منانے کے مستحق ہوں گے اور اسی وقت ہم اپنی نئی تاریخ مرتب کر سکیں گے اور انشاء اللہ العزیز یہ تاریخ ہماری پچھلی تاریخ سے کہیں زیادہ وقیع اور ضخیم ہوگی۔

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

معتمد ادارہ

القسم العربي

تحت اشراف

فضيلة الشيخ محمد عبد الحميد ـ شيخ الجامعة النظامية

و تحت ادارة :

السيد محمد سلطان محى الدين ـ مدير المجلة

عربية أو ترجمة عربية كالهندسة و الجغرافيا و الفلسفة و التاريخ و التقويم و غيرها من العلوم العالية .

و لهذا اللسان خصوصية لا تخفاكم بأن اللفظ المفرد قد وضع بازاء المعنى المفرد أو المركب ، و الألسنة الأخرى ليست بهذه المثابة ، بل وضع فيها اللفظ المفرد بازاء المعنى المفرد و المركب بازاء المركب ؛ و الظاهر أن المفرد يخف به النطق و يرتاح إليه الطبع ، و هذا شأن العربى ؛ وكفاه فضلا على ما سواه من اللغات هذه المزية . أما اللسان العربى من حيث التركيب الجملى فنسبة الألسنة الأخرى إلى العربى كنسبة العريان إلى اللابس .

و أما تاريخ هذا اللسان هو أنه أحد الألسنة السامية التى تكلم به العرب بجزيرة العرب مذ سكنها قحطان رأس قبائل اليمن و يسمون بالتاريخ « العرب العاربة » لأصالتهم فى العربية ؛ و من قبائل العرب « جرهم » التى سارت إلى مكة و احتلتها قبل أن يفد إليها إسماعيل عليه السلام ، فلما جاءها إسماعيل صاهرهم و أقام معهم و كثرت ذريته ، و إنه حيث كان رجلا عبرانيًا كان يتكلم بالعبرية و هى الثانية من السامية . و أمه الصديقة امرأة مصرية جاء بها زوجها الأواه المنيب إلى الله نبى الله إبراهيم الخليل عليه السلام و أسكنها و نور عينه إسماعيل عليه السلام بأمر ربه عز و جل . فأخذ إسماعيل لسان العرب العاربة يومًا فيومًا و لغة فلغة عن جرهم الذين عاشروا معه ، و أقام إسماعيل فيهم ، ولكنه بحكم الضرورة أدخل فى اللسان العربى بعض ما يحفظه من الكلمات العبرانية و بعض ما تحفظه أمه من اللسان المصرى بعد ما هذبا بحسب ما يسهل على اللسان ، و هذا مشاهد ملموس فى تفاعل اللغات المستعملة الدارجة على بسيط الأرض ؛ فلذا يسمى أهل التاريخ سيدنا إسماعيل و ذريته بالعرب المستعربة . و بهذا الوجه صار اللسان العربى فرعين : العربى الحميرى ، و الحجازى العدنانى و هو لغة بنى إسماعيل ؛ و طرق التعبير بهما لا تختلف تقريبا . و الخلاف فى ألفاظ يستعملها الحميريون و لا يستعملها الحجازيون ،

و بالعكس . و المتتبع لألفاظ أهل اليمن و ما يكتب بلسانهم يرى غرابة ، سببها عدم الف الاسماع يحس بها بصلابة لا يجدها فى الألفاظ الحجازية . و الظاهر أن اللسان يتكلم به أصحابه تبعا لمقاصدهم إظهارا للمناوى و أنه يكون فى بدء نشئه كلمات قلائل يتواضع عليها الناس بحسب ما يعن لهم من الحاجة . و أكثرها يكون من الكلمات الدالة على ما يقع عليها الحس . و كلما اتسعت دائرة الحاجات استدل عليها بكلمات تنبىء عنها ، فلذلك كان هذا اللسان أيضا كغيره من الألسنة الحية فى حركة مستمرة إلى الامام و نمو سريع . فكان للعرب فى توسيع نطاق اللسان طرق ثلاث :

الأول : تجديد الوضع . فكانت القبائل تلجأ إليه أحيانا . و ربما اختلفت مواضعهم ، فتجىء للمعنى الواحد كلمات كثيرة . و قد يكون بعض الأسماء مشتقا من صفة فى المسمى و بهذا يجىء الترادف . و أكثر ما يوجد فى أسماء الأشياء التى عند عامتهم لا يستغنى عنها فريق كالابل فلها كما لا يخفاكم ألف أسماء مستقلة ، و كذلك للفرس ألف ، أما الأسد فله خمسمائة اسم ، و السيف فله أيضا خمسمائة ، و الحرب و الرمح و الخمر و ما شاكل ذلك كل واحد منها موزع على أسماء متفرقة عديدة .

الثانى : التجوز ، فكان يتطرق على أبصارهم شىء جديد فيجدون مناسبة بينه و بين شىء آخر له اسم عندهم و ارتباطا و تناسبا ، فيطلقون الأول على الثانى و يسمونه باسمه ، و لكن مع تطاول الأمد و تمادى الزمن ينسى الأول و الآخر منهما . فيزعم المطلع أن الكلمة وضعت فى أصل اللغة وضعًا ابتدائيًا لكل من المعنيين ، و يحكم بأن الكلمة مشتركة ؛ و فى هذا التجوز للعرب شأو وسيع . و أما المعانى التى لا يرونها شريفة و لا يرضون بالتصريح بها كانوا يكنون دائماً بألفاظ مستعارة ، أصلها موضوع لمعنى رفيع ، و متى شاعت الكلمة و كادت أن تكون صريحة فى المعنى الخسيس عدلوا عنها إلى غيرها ، و للعرب نوع آخر من التجوز و هو التعبير باللفظ و إرادة لازمه ، و هذا هو المسمى بالكناية .

الثالث: التعريب. هو استعارة لغة من لغة أخرى بعد تهذيبها، وكان لهم فيه اليد الطولى لأنهم قد اشتغلوا بالتجارة و الأسفار، و ساكنوا الفرس و الروم و الحبشة و الهند و جزائر الهند كالسيلان و مالابار و مالديپ و غيرها، وكانوا قد فتحوا البلاد حتى بلغت سلطنتهم و سيطرتهم من الغانة إلى فرغانة أقصى خراسان، و إلى جبال اورال بأوربا بل كانوا وصلوا إلى أقصى السند؛ وكانت ترد على أسماعهم أشياء جديدة لم يكونوا رأوها فى بلادهم، فسرعان ما يأخذون عن تلك الأمم اسمها بعد التلاعب القليل حتى يكون أسلوب نطقهم و يسهل عليهم تلفظه، هذا هو التعريب. وكان أعظم واسطة لاشاعة الكلمات المعربة حتى يستعملها الجمهور.

الشعر العربى

و ما أدراكم بالشعر العربى! فله أثر عظيم فى النفوس و الضمائر، فان هذا الشعر كان لهم بمثابة الجرائد و المطابع و الراديو فى هذا الدور الحاضر، وكان لهم أسواق لالقاء الأشعار و المحاضرات و تبادل المتاجر فى أماكن مشهورة و هى عكاظ، مجنة، و ذو مجاز؛ أما سوق عكاظ فكانت تقام فى أوائل ذى القعدة إلى عشرين منه بين نخلة و الطائف، ثم مجنة بمر الظهران من عشرين إلى سلخ ذى القعدة، ثم ذو مجاز خلف عرفة، فكانوا يقيمون فيها ثمانيًا من ذى الحجة ثم ينزلون إلى عرفة. وكان شعراء العرب يغدون من كل صوب و ينشدون ما جادت به أفكارهم، و هناك ينال الشعر ما يتحفه من التشريف. و أكثر الممتازين من الشعراء هم العدنانيون و من جاورهم من يمن كامرئ القيس و شعراء الأوس و الخزرج. وكل هذه الطرق أفادت اللسان العربى فائدة عظيمة و هى سعته و قدرته على التعبير عما فى الضمير، فكان وافيا و فوق ذلك صار مستعدًا لأن يقتبس من غيره عند الحاجة و لايحتاج اللسان اكثر من هذا فى استعداده للحياة الدائمة بعد أن يكون سهلا على السمع و اللسان، و هذا ما نحس به فى هذا اللسان الجميل. جاء الاسلام و اللسان العربى قد رقى أعظم درجة وكثر الشعراء النابغون و الفصحاء

القوالون، وكان لقريش خاصة من الفصاحة و الحكم المقبول ما ليس لغيرهم حتى قال الرسول الأكرم سيدنا محمد صلى الله عليه و سلم : « أنا أفصح من نطق بالضاد بيد أنى من قريش » و لذلك كان اللسان القرشى ممتازا تدين له العرب و تعترف له بالسبق إلى أن نزل القرآن الكريم به .

و أما ما قلنا ان الشعر العربى كان أعظم واسطة للنشر و الاشاعة فنزيد تشريحاً بشأنه و هو أن الشعر له أقسام : الغنائى، القصصى، التعليمى، الشرود . فالشعر الغنائى هو الذى يوضع لقصد الترنم به، و هو أقدم الشعر ظهوراً ينطبق على الأغانى التى كانت تترنم بها العرب حداً للابل، و لعلها أول ما ظهرت من الشعر العربى. الشعر القصصى هو الذى يكون موضوعه ذكر حادثة ينطبق على المعلقات السبع من القصايد . الشعر التعليمى هو الذى يكون الغرض منه تعليم الحقائق العلمية أو الأصول الفنية . و الشعر الشرود ينطبق على كثير من شعر أبى العلاء و غيره من الأدبا .

أما أقسام: النثر التاريخ، القصص، الفصاحة، الرسائل و غيرها . فقد استلمتها العربية، و لقد كتب المسلمون فى العلوم ما لا سبيل إلى الحصر و العد. وأما الفصاحة فقد نبغ فيها فى القرون الاسلامية رجال لا يحصون كثرة، أولهم رسول الله ﷺ قديدا بالفصاحة العظيمة و السياسة الالهية و تلاه الخلفاء الراشدون و من بعدهم .

رجال الادب فى الاسلام

من الخطباء أبو بكر الصديق و عمر الفاروق و على المرتضى رضوان الله عليهم و من النساء عائشة الصديقة رضى الله عنها . و من الشعراء: كعب بن زهير و حسان بن ثابت و عبد الله بن رواحة رضى الله عنهم و من النساء خنساء رضى الله عنها . و رجال عصر الأمويين معاوية بن أبى سفيان رضى الله عنه، ابو الأسود الدؤلى، الحجاج الثقفى، سحبان وائل، زياد بن أبيه، جرير، الفرزدق، ذوالرمة و الأخطل . و رجال العصر العباسى وما بعده: الاصمعى، الكسائى، ابن دريد، الخليل، ابن جرير، البخارى المحدث،

مسلم . و الأئمة الأربعة : ثعلب ، الأمين ، الكندى ، حنين ، المبرد ، الرازى ، بشار بن برد ، أبونواس ، أبو العتاهية ، ابن المعتز ، البحترى ، أبو تمام ، الصولى ، الماوردى ، الفارابى ، ابن رشد ، ابن الأثير ، ابن جنى ، أبو الفرج الأصفهانى ، الصاحب ، بديع الزمان ، الحريرى ، المتنبى ابن مالك و غيرهم من الأدباء .

عوامل الرقى الادبى

أول عوامل الرقى العلمى كان القرآن الكريم ، لا بصفته كتاباً أنزل بلسان عربى مبين فقط و له مكانة لايتدركه فيها غيره من علو الاسلوب فقط ، بل لصفات عظمية فيه أرقى من ذلك بكثير و هو كونه مستودع الأصول الأدبية التى دفعت الأمة العربية إلى باحات المعارف دفعاً أصوليا ، و نهجت لمجهوداتهم مناهج حكمية أثمرت لهم فى سنوات قليلة ، ما لم تثمر ه المجهودات لسواهم فى قرون متطاولة ، فان عجب الناظر فى سرعة انتقال تلك الأمة من حالها الانحطاط الفكرى إلى درجة عالية من الحياة الأدبية فى سنوات معدودة لا تكفى فى العادة لسعة الأدوار التى تقتضيها أطوار النشر ، فأولى به أن يبحث عن علة ذلك فى ذات القرآن الكريم ، فهو مستودع هذا السر الجليل . جرت سنة الله فى الأمم أنها متى اتجهت للحياة الأدبية تندفع إليها اندفاعاً مشوشا فيستولى أمرها إلى قرن بعد قرن . و لو بحث الباحث عن نشو المعارف اليونانية أو الرومانية لوجدها ثمرة انقلابات شتى ، بخلاف الأمة العربية فما ظهرت فيها الدعوة الاسلامية القرآنية حتى تراها الناس بعد قرن من الزمان حاملة لواء العلوم الأدبية و الطبيعية فى بسيط الأرض انقلابا سريعا مدهشا و إن هذا الانقلاب ثمرة من عوامل فعالة مثارها و مدارها هذا القرآن المجيد .

و إليك والبيان

و ما كثر ما فى القرآن آداب و أخلاق ، و قد تلقاه العرب و هم فى فراغ من البال ، فتمكن من نفوسهم و سطت تعاليمه على مشاعرهم فقاموا على سننه فى البحث

و النظر و الاستدلال ، كما قاموا عليها فى الصلاة و الصيام و الحج و الزكاة . و الذى ينظر لآداب القرآن العلمية يجدها أرقى من الأصول التى تفتخر بها الفلسفة العصرية و تقدمها للناس كأنها من مكتشفاتها الحديثة التى لا كمال فى العالم إلا بها . فأول أصل وضعه القرآن الحكيم لذويه قوله تعالى « و ما أُوتيتم من العلم إلا قليلا » . فبهذا عرف كل مسلم حده و أدرك جهله ، و أدرك الانسان حده و مبلغ جهله ، أول درجات الطلب للعلم بل اول درجات الفلسفة العالية و الكمال الذى ليس وراءه مرمى .

و الأصل الثانى : « و قل رب زدنى علما » . و بهذا اندفع المسلم لطلب العلم بدافع العقيدة ، و لكن أى علم يطلب ؟ و العلوم فى عصر العرب كان أكثرها ظنوناً و أوهاماً تحتاج للتعيين ، فجاء الأصل الثالث رادعا له عن الأخذ بغير تفد و تنقير .

الأصل الثالث قوله تعالى : « و ما ذا بعد الحق إلا الضلال » . فبهذا ادرك ان غرضه من العلم يجب أن يكون الحق ، و لكن أهل الحق ما عليه الناس من العلوم ؟ فجاء الأصل الرابع زاجراً له عن الثقة بكل ما سمى علما .

و الأصل الرابع قوله تعالى : « إن يتبعون الا الظن و إن الظن لا يغنى من الحق شيئا » . بهذا الأصل وقف المسلم حائرا لا يدرى أى طريق يسلك لطلب الحق ... ؟ فجاء الأصل الخامس بشىء من الارشاد .

الأصل الخامس قوله تعالى : « و لا تقف ما ليس لك به علم إن السمع و البصر و الفؤاد كل أولئك كان عنه مسئولا » . بهذا انسد فى وجه المسلم باب التظنى و التخيل فى العلم و تقرر لديه أنه مسؤول عما تسمعه أذنه من افك و يبصره بصره من حرام و يعيه قلبه من باطل . . بهذا اعتراه شىء من الذعر والخوف ، و تطلب المخرج من هذه المسؤلية الشاقة ، و رجا أن يهديه الله لطريق العلم الحق و يذوع الحكمة الصحيحة ، فجاء الأصل السادس بالبيان .

الأصل السادس قوله تعالى : « قل انظروا ما ذا فى السموات والأرض » .

بهذا أدرك المسلم أن الكون مستقر العلم و محل الدرس ، و لكن أين الانسان من الكون ؟ اين الضعف من القوة ، نواميس عاملة و قوى قاهرة .... ؟ أين الانسان من هذا كله .... ؟ فجاء الأصل السابع كاشفاً له عن مكمن قواه و مبلغ استعداده .

الأصل السابع قوله تعالى : «خلق لكم ما فى السموات و ما فى الأرض جميعاً منه » . بهذا عرف انه الملك المستقل لهذا الكون ، و لكن تحير فى كيف تجد طريق تلك السيطرة ؟ فجاء الأصل الثامن هادياً له ذلك الطريق .

الأصل الثامن قوله تعالى : « و الذين جاهدوا فينا لنهدينهم سبلنا و إن الله مع المحسنين » . و بهذا الأصل أدرك المسلم ان المسألة مسألة جهد و استدلال ؛ فاندفع بهذا الطريق فى دائرة هذه الأصول الثمانية . فهل تعجب بعد هذا ، ان اصبح المسلمون بعد قرن من الزمان و فى يدهم لواء الخلافة العلمية فى الأرض .... !! سلك القرآن الكريم فى كل ضرب من ضروب الشؤن الحيوية هذا المسلك من تاصيل الأصول . فلما أخذ به المسلمون بلا تبديل و تغيير ، بلغوا إلى نتائج مدهشة . فالقرآن هو العامل الأكبر فى إحياء العرب تلك الحرة العلمية ، ثم يليه رسول الله ﷺ ، فانه كان خلقه القرآن ، فدعى للعلم ، و اكرم العلماء ، و وضع أصلين كانا لهم أكبر الآثار فى توطيد تعاليم القرآن ؛ أحدهما اصل أدبى ، و هو قوله عليه السلام : خذ الحكمة ، الحكمة ضالة المؤمن حيث و جدها فهو أحق بها . فعلى المسلم ان يأخذ الحق حيث وجده و لو فى فم عدوه . و الأصل الثانى عملى و هو اكبر ما اثر عنه ﷺ من هذه الجهة ، و هو أخذه بالأحسن من كل يراه ، بالأصل الأول لم يأنف المسلمون أن يأخذوا حكمة اليونان و حكمة الهنادك ، و الرومان و الفرس و يدرسوها فى المدارس و المساجد ، و هو حادث ليس له نظير فى تأريخ أديان العالم باسره ، خصوصا فى أبان نشأتها . و بالأصل الثانى لم يجد العرب فى أثناء الفتوحات شيئا حسنا إلا أخذوه أخذ شره و نهم ، فجمعوا بين حسنات مدنية الرومان و حكمة الهند و الفرس و أصبحوا خلفاء الله فى الأرض سنين طويلة .

فهذه الأصول جعلت المسلمين فى صدر الاسلام فى حالة حركة مدهشة، كأن المطلع عليهم فيها تأخذه الحيرة و الدهشة لا يكاد يفقه أ ذلك من علة معقولة كان يجد قوما منهم يستعمرون الأقالـــيم و جمهوراً يترجمون الكتب اليونانية و آخرين يمحضون الأحاديث، و طائفة تدون اللغة، و جماعة تبحث فى الطبيعيات و غيرها، حتى لم يمض إلا القليل حتى أصبح العلم عربياً بعد أن كان يونانيـا أو رومانيا . و لبست الاسلامية حلة جميلة فيها من كل مدنيـــة لوناً ناصعا مع حفظ المسلمين لشخصيتهم فى وسطها اللامع المميز .

فأول فنون عربية فن الشعر و الخطابة، و إنهما نشئآ على حالة سذاجة بدوية ثم ارتفعت رويداً رويداً ثم يلى هذين الفنين فن الخط . و أول من أخذ الخط عن الفينيقيين أهل اليمن، و هو الخط الحميرى المسند، ثم منهم بنو طى و أخذه عنهم أهل أنبار، و عنهم تلقاه أهل الحيرة فنقله عنهم الى الحجاز حرب بن أمية، ولما بعث النبى ﷺ لم يكن بمكة غير رجلين يعرفان الكتابة . و لما حدثت وقعة بدر و كان فى أسرى المشركين من يحسنها جعل رسول الله ﷺ فداءهم ان يعلموا بعضا من أولاد المسلمين، و لما انتقل النبى ﷺ إلى الدار الباقية و ترك المسلمين و جمعهم على القرآن الكريم و أصول العلم فجمع القرآن و تحريت قراءته و حفظ الحديث و تكلم فى الغزوات النبوية و آخرون فى الفقه و استظهار اللغة . و أول ما دون من العلم بنبراس القرآن النحو و كان ذلك فى عهد على رضى الله عنه و باشارته كتب فيه أبو الأسود الدؤلى المتوفى سنة ٦٩ ﻫ مبادئ اولية، ثم لما تولى الخلافة عمر بن عبد العزيز سنة ٩٩ ﻫ، أمر بتدوين الأحاديث، ثم أبو حنيفة النعمان دون مذهبه فى الفقه من سنة ٨٠ ﻫ إلى سنة ١٥٠ ﻫ، ثم الخليل، ثم أبو عبيدة، و لما ولى الخلافة المنصور سنة ١٣٦ ﻫ امر بترجمة بعض الكتب اليونانية، فجاء هارون الرشيد فزاد هذه الحركة العلمية، ثم أعقبه ابنه المأمون فأبلغها غايتها .

ضرورة الادب العربی

أما ضرورة الأدب العربی واللسان العربی فظاهر ، ان تعلم هذا اللسان السعید بنظر الشرع الاسلامی فرض أکید کما قیل :

حفظ اللغـات علینـا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ فرض کفرض الصلاة
فـلیس یضبـط دین ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ إلا بحفـظ اللغـات

و إن النبی ﷺ رغب إلیه الناس ، و ندب إلی تعلیمه و تعلمه فقال علیه السلام : من تکلم بالعربیة کان کلامه ذکرا . و قال علیه السلام : من اراد علم الأولیین و الآخرین فلیتدبر القرآن . فالظاهر ان التدبر لایمکن إلابتعلم اللسان القرآنی ، الأول التفهم ثم التدبر، و کذا المعرفة بالقرآن هی الحکمة فروی أن ابن عباس رضی الله عنهما قال : الحکمة هی المعرفة بالقرآن ، و قال علیه السلام : من تکلم بالعربیة و رضی دین العرب دینا لنفسه و رضی حکمها له و علیه فهو عربی ، و قد برئ من العجمة و برئت منه .

و قال یوما لسلمان الفارسی رضی الله عنه ، أحب العرب لثلاث ، قرآنک عربی ، و نبیک عربی ، و لسانک فی الجنة عربی . و قال علیه السلام : اعربوا القران فانه عربی ؛ مقصوده علیه السلام ان القرآن نزل باللسان العربی فعلیکم ان تتعلموا اللسان العربی ، حتی تکونوا علی بصیرة من مطالب القرآن . و بمثل هذا ورد عن النبی الکریم علیه السلام انه کان یعتنی به اعتناء شدیدا ، و یرشد الأمة بعظیم ارشاده علیه السلام ؛ رحم الله امرء اصلح من لسانه ، و کفی به اهتماما بالشرع ، حیث ان الصلاة لاتجوز خلف من لا یحسن اعراب القرآن ، قال ابو بکر الصدیق رضی الله عنه : لأن اعرب آیة من القرآن احب الی من ان احفظ آیة ؛ و قال عمر بن الخطاب رضی الله عنه : لأن أقرأ فأخطی احب الی من ان اقرأ فألحن . لانی إذا اخطأت رجعت ، و اذا لحنت افتریت . قال أیضا : لایقرئ القرآن الاعالم باللغة ، تعلموا السنن والفرایض واللحن کما تتعلمون القرآن . و قال ایضا علیکم بالفقه فی الدین و حسن العبادة و التفهم بالعربیة . ففرق رضی الله تعالی عنه التفهم فی العربیة بالفقه و العبادة

و كانه اشار به الى ان تعلم اللسان العربى لازم شرعى . و قال العلامة السيوطى: ان علم اللغة من الدين . و قال صاحب الأمالى: الفقيه يحتاج الى اللغة حاجة شديدة . و قال عمر رضى الله عنه: تعلموا العربية فانها تثبت العقل و تزيد فى المروة . فجعل العربية توطئة للعقول وانه رضى الله عنه مر بقوم مرة يتناضلون و رمى بعضهم فأخطأ، فقال له عمر رضى الله عنه اخطأت، قال: يا امير المؤمنين! نحن متعلمين؛ فقال: و الله لخطؤك فى كلامك اشد علينا من خطئك فى نضالك، احفظوا القرآن و تفقهوا فى الدين و تعلموا اللحن . فعلم ان المراد باللحن هو اللغة . ان رجلا رفع الشكوى الى على رضى الله تعالى عنه فى رجل انه لايوديه ماله الذى عليه، فدعا المدعى عليه فعذر على رضى الله عنه اليه وطلب منه الرد فقال: يا اميرالمؤمنين ماله عندى حق، فقال له على رضى الله عنه: ادفع إليه ماله حسب اقرارك، فقال: و كيف ذلك و انا اردت نفى المال عنى؟ فقال على رضى الله عنه: فسد اللسان ورب الكعبة يا ابا الاسود! انح للناس نحوا يعتمدون عليه . و قيل ان ابا الاسود سمع بنية له صغيرة تقول و قد نظرت الى السماء فقالت له: يا ابت! ما أحسن السماء ـ بالاضافة؛ فقال: نجومها، فقالت لم ارد هذا انما اردت ان السماء حسنة، فقال: فقولى اذا: ما احسن السماء بافعل التعجب فلما؛ اصبح ذهب الى على رضى الله عنه و ذكر له ذلك و قال: انى اخاف ان يفسد لسان العرب، فصنع ابوابا فى اللسان العربى، و قيل انما صنع ذلك حين سمع رجلا يقرء «ان الله برئ من المشركين و رسوله» با لجر محل الرفع فى «رسوله» فاستعظم ابو الاسود ذلك، و قال: عز وجه الله ان يبرئ من رسوله؛ و قال: لا يسعنى إلا ان اصنع شيئا اصلح به لسان قومى، ثم ذهب من فوره، و وضع ابوابا فى العربية . وكان عبد الله ابن عمر رضى الله تعالى عنهما يضرب و لده على اللحن . قال رجل للحسن: يا ابوسعيد، فقال له الحسن كسبك للمال شغلك ان تقول: يا أبا سعيد! ثم قال: تعلموا الفقه للدين و الطب للأبدان و النحو للسان . و أتى عثمان البستى الى الحسن فقال: ما تقول فى رجل زعف؟ فقال له الحسن . و ما زعف؟ لعلك تريد رعف! قال: فاستحيى البستى وطلب العربية .

دخل رجل على زياد فقال له : ان ابينا هلك ، وان اخينا غلبنا على ميراثنا من ابانا ، فقال له زياد : ما ضيعت من نفسك اكثر مما ضاع من مالك ! و جاء رجل الى احد الفقها . فقال له : رجل هلك و ترك أبيه و أخيه فقال له الفقيه : قل ! و ترك أباه و أخاه ، فقال الرجل : وترك أباه و أخاه ، فما لأباه و ما لأخاه ، قال له : قل ! فما لابيه و ما لأخيه ، فقال له الرجل : ما اراك تريد إلا خلافى ؛ و مر و تركه . و سمع اعرابى اماما يقرأ « ولاتنكحوا المشركين حتى يؤمنوا » بنصب التاء فى « تنكحوا » فقال : سبحان الله ! هذا قبل الاسلام قبيح فكيف بعده ؟ فقيل له ان الامام الحن و إنما القراة و «لاتنكحوا» بضم التاء ، فقال : قبحه الله لا تجعلوه بعدها اماماً فانه يحل ما حرم الله . و دخل اعرابى السوق فسمع الناس يلحنون فقال : سبحان الله يلحنون و يربحون ! و قال بعض السلف : ربما دعوت فلحنت فأخاف ان لايستجاب لى . و سمع الاصمعى رجلا يدعو ربه ، و يقول فى دعائه : يا ذو الجلال والاكرام فقال له : ما اسمك ؟ فقال : غوث . فأنشد يناجى ربه باللحن : غوث فلذا ربه لايستجيب . حدث هيثم عن بعض الشيوخ ان رجلا اتى منزل ابراهيم فقال : اههنا ابا عمران ؟ فسكت ابراهيم فقال أههنا ابى عمران ؟ فقال ابراهيم ! قل الثالثة و ادخل . قال الاصمعى : ان اخوف ما اخاف على طالب العلم ان لم يعرف النحو ان يدخل فى جملة قول النبى ﷺ : من كذب على متعمدا فليتبوأ مقعده من النار ، لأنه عليه السلام لم يكن يلحن فيما رويت عنه و لحنت فقد كذبت عليه . و قال أيضا : سمعت حماد بن سلمة يقول : من لحن فى حديثى فليس يحدث عنى . و قال الخليل : لحن ايوب مرة فقال : استغفرالله ، و سأل رجل الحسن فقال : يا ابا سعيد الرجل يتعلم العربية يلتمس بها حسن المنطق و يقيم بها وقراءته فقال : يا ابن اخى فتعلمها فان الرجل يقرأ الآية فيصرفها عن وجهها فيهلك فيها . و يقال : اذا اردت ان تعظم فى عين من كنت عنده صغيرا و يصغر فى عينك من كان عندك كبيرا فتعلم العربية . قال الامام الشعبى : الآداب و العربية رأس كل صناعة . قال حماد بن سلمة : انفقت على الحديث اربعة الآف فليت ما انفقت على الحديث انفقت على الادب

فان النصارى صحفوا حرفا واحدا فكفروا، اوحى الله الى عيسى بن مريم عليهما السلام: «انت نبى، و انا ولدتك» فأبعدوا التشديد من «ولدتك» فقرؤا، «انت ابنى و انا ولدتك»، فكفروا . قال: عبد الملك بن مروان: أصلحوا من ألسنتكم فان المرء تنوبه النوبة فيستعير الثوب و النعل، و لا يمكنه ان يستعير اللسان . قال عبد الله بن المبارك: انى قد انفقت فى الأدب و اللسان مثل جميع ما انفقت فى تحصيل الحديث، قيل: و لم؟ فأجاب ان النصارى قد كفروا لنقصهم التشديد الواحد و هو ان الله خاطب عيسى عليه السلام بقوله «ياعيسى! انى ولدتك من عذراء البتول مريم» أى إنى خلقتك بقدرتى الكاملة و اخرجتك من بطن امك البرة، و لكن النصارى صحفوا هذه الكلمة و بدلوها و قالوا «انى ولدتك» اى انا والدك و انت ولدى، فتعالى الله عما يشركون! فجعلوا الولادة رابطة بين الخالق و المخلوق و العبد و المعبود، تعالى الله عن ذلك علواً كبيراً . قال الامام الشافعى رحمه الله: على كل مسلم ان يتعلم من لسان العرب ما بلغه جهده حتى يشهد به ان لا اله الا الله و ان محمدا رسول الله، و يتلو به كتاب الله، و ينطق بالذكر بما افترض عليه من التكبير و امر به من التسبيح و التشهد و غير ذلك، فما ازداد من العلم باللسان الذى جعل لسان خاتم المرسلين و انزل به القران المبين و فيه علم الآولين و الآخرين كان خيراً له من الحمر النعم، كما عليه ان يتعلم الصلاة و الذكر فيها .

اعتنا العوالم بمناسبة هذا اللسان العربى

لايفوتنى ان اذكر هناك شهادة جريدة فرنساوية التى قد اشتهرت قبل سنوات و هى! قال المدير: ان اللسان العربى ليس بأجنبى لنا بل هو ميراث قومنا، و هذا اللسان لسان قوميتنا و ملتنا، و الحكومة الفرنساوية صارت مثل الحكومة الاسلامية لآن عدد المسلمين الكثيرين يعيش تحت حمايتنا وحكومتنا، فالواجب على الحكومة ان تعتنى اعتناء

شديدا بصدد التعليم العربي . فنظرا الى هذا اجرى وزير المعارف مسيوزاى العربية بمدارس پاريس لوى بجران و مرسيليا . وكذلك قال المستشرق مسيوماسِتن مشير الحكومة الفرنساوية انى اتأسف شديدا على ان فاضلا من افاضل العربية و العلوم الاسلامية لايوجد عندنا بپارس . فواجب على الفرنسة ان تختار السياسة العربية عملا و مباشرة و تجرى العربية فى مدارسها لأن اللسان العربى لسان حي فى هذا الدور الحاضر و انه لسان مئات ملايين من الأقوام الراقية ، و تنشر الجرايد ، و تذاع الانباء بالراديو وغيرها من المراكز العديدة ، و مع هذا ان هذا اللسان العربى ليس بأجنبى لنا بل هو ميراث قومنا كابرا عن كابر . و هكذا جريدة الأهرام ذكرت بأعدادها الماضية قبل سنوات ان حكومة ألطليان الزمت العربية لزاما باتا فى مدارسها الثانوية وطلبت علماء العربية من مصر و غيرها من البلاد العربية لتنفيذ هذا المرام . أفلا نترجى من عواطف الأقوام الآسوية و العوالم المشرقيه ان تختار بينها رابطة علمية بينها تحي ذكرى النبغاء الأقدمين و تقدم اقداما فى ميدان العلم الصحيح الى الامام . خصوصاً اذا رأينا برأى العين فى الدور الحاضر ان عصبة الأمم قد اضطرت وقتئذ ان تعد هذا اللسان العربى ايضا من الألسنة الأصلية و عدته رابع الألسن العالمى تقديرا و تنويها بشان هذا اللسان الجميل .

فلو نهضت الأمة الشرقية بأعباء هذا الأمر المنشود لوجدت بيدها اداة هذا اللسان العربى بحده و حديده ، و انه بسعته و جزالته و صلابته و رونقه يستطيع ان يثبت رابطا و ثيقا بين الألسنة و مترجما حقيقيا بين أفراد البشر ، و يقدر ان يربط اهل العلم و الفن فى رباط واحد .

و املنا فى طلبة العربية بمشارق الأرض و مغاربها كبير ، خصوصا فى طلبة الجامعة النظامية و الجامعات العربية فى الهند و غيرها عظيم ، فهولاء الشبان المستنيرون متى تنبهوا و نهضوا لتوسيع نطاق اللسان العربى استطاعوا ان يجعلوا الحياة روحية يملؤها

سعادة و رفعة، و لا نتردد بأدنى تردد بل نقول بجرامة تامة و يقين كامل ان الجامعة النظامية فى ادوارها السابقة و اللاحقة قد ادت ما عليها و خدمت العربية خدمة جليلة قرنا بعد قرن لاينساها التاريخ الى ممر الأيام و الدهور .

و هذا ما لزم . و الحمد لله فى البداية و النهاية . و الصلوة و السلام على سيدنا محمد و آله و صحبه اولى الرواية و الدراية اجمعين .

قال الحسن : الناس ثلاثة ، فرجل رجل ، و رجل نصف رجل ورجل لارجل فأما الرجل فذوالرأى و المشورة ، واما الرجل الذى هو نصف رجل فالذى له رأى و لا يشاور ، و أما الرجل الذى ليس برجل فالذى ليس له رأى و لا يشاور

★★★

ان الحكيم اذا اراد امرآ شاور فيه الرجال و ان كان عالما خبيرا ،لأن من اعجب برأيه ضل ، و من استغنى بعقله زل .

النور وطبقاته

للأستاذ الجليل السيد طاهر ، شيخ التفسير بالجامعة

لا يخفى على سيادتكم أن الله عز و جل خلق نور محمد صلى الله عليه وآله و سلم قبل أن يخلق العوالم كلها ؛ ثم خلق العوالم عالماً بعد عالم .

فأول طبقة خلقها من نور محمد هى طبقة عالم الأرواح يقال لها : عالم النور ، ثم خلق عالم المثال الذى فيه امتزاج النور بالظلام ، و هو عالم لطيف امتزاجى بنوع من الكثافة . ثم خلق عالم الأجسام ، و هذا عالم كثيف لزيادة الظلمة فيه ، و أيضاً يسمى لذالك : عالم الدينا ، و لا عالم أسفل منه .

و النور الخالص أصل شىء من الأشياء ، و من هذا العالم تتجلى الصور النورية ؛ و الظلمة الخالصة ليست بشىء لكونها عدما ، إلا أن وجودها لا يعتبر إلا بالعقل ، و إذا وقعت الحجب فى طبقات النور ظهرت الظلمة . و من ههنا تحققت الغيرية ، وكل ما فوق هذا العالم تقل ظلمته و يزداد نوره على قدر الترقى إلى عالم النور الأصلى . وكل طبقة فى المعالى تكون ألطف مما هو أسفل منه ، وكل سفلى تكون أكثف مما فوقها .

و السالك إذا عرج و ترقى برياضة النفس إلى العالم العلوى يرى كل عالم يعرج فيه و وجود نفسه مثل ذلك العالم فى اللطافة ، و لأجل لطافته ينكشف له ما فى ذلك

العالم و ما تحته لأن نظره إلى ما فيه هو أو إلى ما هو تحته ، لا يحجب شيء للطافة نظره و صفائه . و من نزل من المقامات العالية إلى السافلة يقل نوره و تزداد كثافته فلا يرى العالم الذى هو فيه و نفسه إلا على مثل ذلك لضرب الحجب من الكثافة بينه و بين النور فتختفى الأشياء عن نظره فلا يرى إلا ما يمتد إليه بصره و يدركه . و إن الله سبحانه تعالى من علينا بارسال الرسل و بعثة الأنبياء إلى المكلفين على الطاعة من الجن و الانس ليهدوهم طريق الترقى من العالم الأسفل إلى العالم القدس الأعلى برياضة نفوسهم و العمل بما أنزل الله على أيديهم من الأوامر الالٰهية و الاجتناب عن المعاصى . فأول ما يجب عليهم الاقرار بالقول الثابت باللسان و التصديق بالجنان ؛ و القول الثابت : كلمة التوحيد و هو شهادة أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له و أن محمداً عبده و رسوله ؛ فمن قالها بلسانه و تصديق قلبه و ترقى من الأسفل إلى الأعلى كما يظهر بقوله تعالى « ثم رددناه أسفل سافلين إلا الذين آمنوا » الآية ، فقد استحق و لحق بأصله الذى هو شعبة من نور نبينا ﷺ .

و الدليل على أن الله خلق العوالم من نور محمد ﷺ قوله : أول ما خلق الله نورى ، خلق العالم . و كل ما فى الوجود من الأنبياء و الرسل و الصالحين و الملائكة المقربين و ما سواهم خلقوا من نوره ﷺ و معراج هؤلاء السادة الكرام ينتهى إلى نور نبينا ﷺ لأنهم تكونوا منه فينتهون إليه ، و هذا النور واسطة بين الخلق و الخالق، و معراجه إلى الله تعالى بلا واسطة بينه و بين ربه ، كان له فى كونه مع ربه وقت مستمر دائم لا وقت من الأوقات، لأن الحالة التى كانت له صلى الله عليه و آله و سلم فى كونه مع ربه لا تزول عنه و لا تفارقه؛ و إن الملائكة المقربين و الأنبياء المرسلين و من دونهم من الأولياء الصالحين لا يدخلون ذلك المقام لعدم استعدادهم لذلك ، فلو أرادوا أن يرتقوا مما هم منه لاحترقوا فلا يبق لهم عين و لا أثر، كما قال جبرئيل عليه السلام : لو دنوت أنملة لاحترقت ؛ أى لو دنوت قيد أنملة إلى ربى مرتقياً مما أنا منه لاحترقت . فثبت بذلك أن كل نبى مرسل و كل ملك

مقرب لا يرتقى من مقامه إلى ما هو فوقه . و قول الملائكة فى القرآن المجيد « و ما منا إلا له مقام معلوم » دليل على ذلك . و الأنبياء المرسلون و الملائكة المقربون و الأولياء الصالحون و المؤمنون كلهم خلقوا من نوره الخاص على قدر مدارجهم الثابتة فى علم الله قبل أن يخلقهم ، و غير هؤلاء من الكائنات خلقوا من نوره العام .

و أصل النور الوجود ، و يتصف كل موجود بما فيه من الصفات لا بما فى غيره .

و أسفل ما يكون من الطبقات فى عالم الأجسام طبقة الجماد ، لا توجد فيها صفات من التحرك و النماء و غيرهما إلا أن وجودها هو حياتها . و فوق هذه الطبقة طبقة النبات ، و فى هذه الطبقة لنمائها و ترقيها من مادة جامدة إلى مادة نامية بالطبع يظهر بعض صفات الوجود و هو الحركة الطبيعية فى النماء و الحياة . و فوق هذه الطبقة من النبات طبقة الحيوان ، و هذه الطبقة تظهر فى أهلها الصفات التى كانت كامنه فى الحياة معها من الحركة الارادية و قطع المسافة من مكان إلى مكان ، و يكون ظهور الدم فيها يحس بالنفع و الضرر و الراحة و كسب ما يريد للانتفاع به لنفسه و الاضرار بغيره ، و اضعف صفة العقل ينقاد للانسان . و فوق هذه طبقة الجان ، و فيها تظهر صفات العقل إلى حد معلوم ، و يكتسب الخير بالارادة لنفسه و يضر غيره بالارادة ، و لذا صار مكلفاً على اتباع أحكام الشريعة . و فوق هذه طبقة الملائكة النورية ، منهم جبرئيل و ميكائيل و إسرافيل و عزرائيل و حملة العرش ؛ و فوقهم طبقة العالين و هم الذين لا اعتبار للعناصر فيهم رأساً ، و هؤلاء النورية الصرفة ، و فيهم قال الله تعالى لابليس « أستكبرت أم كنت من العالين؟ » لأن علوهم بأنفسهم و لم يؤمروا بالسجود لآدم لأنهم لا يعرفون غير الله و لا يعرفون آدم و إبليس فضلا عن أن يؤمروا بالسجود لآدم ؛ و فى الحديث : إن لله أرضاً بيضاء مسيرة الشمس فيها ثلاثون يوماً ثلاث مرات مشحونة خلقا لا يعلمون أن الله خلق آدم و إبليس ـ رواه ابن عباس (كما فى كتاب الأربعين للامام الغزالى) . و فوقهم عالم الانسان المحيط بجميع عوالم الأكوان ، و ليس فوقه إلا الله وحده لا شريك له ؛ و لذلك جعله الله تعالى

خليفة على سائر خلقه، و من العالم الأسفل إلى العالم الأعلى فى كل طبقة إنسان يدور عليه أمرها، و هو قطب تلك الطبقة.

و مما لا شك فيه أن فى الانسان من مادة الجماد عظامه، و من مادة النبات نماءه و ترقيه. و من مادة الحيوان تحركه بالارادة، و من مادة الجان امتزاج وجوده بنار مارج سموم مع شيء من الهواء و من مادة الملائكة النورية خلاصه من ظلمة الكثافة مع بقاء مادة لطيفة من العناصر، من خلقة العالين فيه تنزهه من العناصر رأساً. و هذه الأوصاف توجد فى الانسان كما ذكرت آنفاً. فلذا صار أشرف المخلوقات كأنه مستجمع بجميع صفات الكمالات. و من حيث سخر له ما فى السماوات و الأرض جميع من الله تعالى كما قال عز وجل فى القرآن المجيد «سخر لكم ما فى السموات و الأرض جميعاً منه». و هذه نعمة كبيرة على الانسان، أنعم بها عليه بسبب جعله خليفة له.

و الانسان الكامل سيد الكونين إمام الأنبياء و الرسل محمد ﷺ؛ و من تبعه باحسان فى ظاهره و باطنه فهو لاحق به، يقال لهم «الانسان الكامل» تبعاً له و من لم يتبعه من المومنين بالاحسان ـ كما ينبغى، فليس بانسان كامل بل إنسان من الناس ستنار قلبه بنور الايمان على قدر مدارجهم فى الايمان و العمل بما أمر به.

و الذين اتبعوه ظاهراً و باطنا على قدر استعدادهم فهم الأنبياء السابقون لأنهم كانوا نائبين له فى النبوة و الشريعة.

و من لم يترق إلى أن يكون إنسانا كاملا غير أن آمن بالله رسوله و عمل بما تيسر له فهو مؤمن، و لم يؤمن به و برسوله فهو كافر ينال فى الآخرة العاقبة السوىء و يدخل الجحيم لكفره.

فالحاصل أن من خلق من نوره الخاص لحق به ﷺ على قدر ما قدر الله له منه، و من خلق من نوره العام يكون فى الدنيا و يفنى. رزقنا الله و إياكم سعادة الدارين و تباع سيد المرسلين فى جميع أحوالنا الظاهرة. و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.

الجامعة النظامية وطلابها

لاستاذ الجامعة السيد طاهر بن العلامة الأديب السيد ابراهيم الرضوی ـ رحمه الله ،
أستاذ اللغة العربية بالجامعة العثمانية

بيت علوم الله جل نواله ... و أنوار فضل الله فی حسن حاله
لقد فجرت فيها عيون كثيرة ... فمن يغترف يرجع بخير ماله
و منها يروی كل من طلب العلی ... و يشكر ذا الفضل العظيم بباله
و إن سعيه إلا إلى الله ربه ... و ليس له إلا الاجزاء فعاله
ألا فانتهوا عمانهاكم و بادروا ... بتوبتكم من قبل حل و باله
الو الأمرمنكم فاقتفوهم بحكمهم ... يزينكم رب الوری من جماله
و لابد من علم لما تعملونه ... و ما ان يفيد الفعل دون احتماله
الا شأنكم يسمو ويرقى شرافة ... من العلم إن أو تيتم بجلاله
لقد قلت ما لابد منه نصيحة ... لكم ودعوا ما يقتضی بزواله
لقد اجتمعتم سامعين خطابتی ... و فيها لمن يصغی ترقی كماله

زاد الآخرة

خواجه شريف، المدرس بالجامعة

ألم تعلم حياة الدين و الدنيا — و ما ذا كائن فى دارها العقبى
فلا تعرض و لا تغفل ولا تذهل — عن الحق و لا عن سيرة حسنى
تزود كل شىء ما من الخير — لأن الخير يهديك إلى التقوى
و لا ترجع إلى ما ليس يغنى عنـك — شيأ فى أمور الدين و الأخرى
فيجزى كل عمال بلا نقص — من الله العزيز العالم الأعلى
فلا خوف و لا حزن على من فى — قريب رحمة من نوره الأجل
فما هذا سوى الذكرى لكم منا — إليه صحبنا توبوا لكم طوبى

فضل الصدق

الحافظ رحيم خان - متعلم الجامعة

ألا إنما الانسان بالصدق يفضل — به فى مراضى الله و الرسل يدخل
به المرء ينجو من جميع مهالك — و ينحو إلى الله العزيز يعدل
فطوبى لمن قد كان فى القول صادقا — و أنوار إيمان له منه تكمل
به الناس ما زالوا يساقون — إلى من به الأبرار فى الخلق فضلوا
لقد خاب من لاقوله و فق قلبه — و ذلك ممن عندنا ليس يقبل
إذا كان طبع المرء سوء فانه — يظن ظنونا كيف شاء يمثل
ألا الزموا صدقا دواما فانما — بـه للعيون قرة حيث تمقل

* * *

جامعہ نظامیہ شبلی گنج حیدرآباد ۲